ISSN 0974-7346

فروری ۲۰۲۶ء

جلد ۲۱۳ ــــ عدد ۲

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام:Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر:4761005500000051

آئی ایف ایس سی:PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ ماہ شعبان المعظم ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۲۶ء عدد ۲

مجلس ادارت

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:

ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۴
مقالات		
ملفوظات نگاری: نثری اظہار کا غیر افسانوی بے صنف نقش	پروفیسر مجید بیدار	۷
تجدید علم کلام اور وحدت الوجود: شبلی اور وویکانند کی ہمنوائی	ڈاکٹر نذیر احمد عبد المجید	۱۸
ہندوستانی ملکائیں وشہزادیاں اور فارسی زبان وادب	محمد رضا اظہری (علیگ)	۲۶
مطبع معارف کی اشاعتی خدمات	طلحہ نعمت ندوی	۴۸
اخبار "مدینہ": بجنور کے چھوٹے قصبے سے عالمی افق تک	محمد علم اللہ	۵۸
اخبار علمیہ	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان	۶۵
باب التقریظ والانتقاد		
گیان چند جین کے خطوط مشاہیر ادب کے نام	کلیم صفات اصلاحی	۶۶
تبصرۂ کتب	ع۔ص، ک۔ص اصلاحی، ف۔ اصلاحی	۷۲
ادبیات		
غزل	وارث ریاضی	۸۱
رسید کتب موصولہ		۸۲

شذرات

ہم ہندوستانیوں کے لیے جنوری کا مہینہ، ماہ جمہوریت کی امتیازی شان وشناخت سے سرفراز ہے۔ چند دنوں کے بعد چھبیس تاریخ اسی شان کا یوم اعلان ہے کہ ایک طویل عرصہ کے بعد ملک کو آزادی کی نعمت ملی اور ایک قطعی غیر ملکی، غاصب اور غیر قانونی طور پر قابض قوم اور اس کے نظام ملوکیت سے رہائی کی خوشی ملی اور ملک کی روایتی صفات فکر وعمل کے ساتھ نئے جمہوری نظام حکومت کا قیام عمل میں آیا اور توقع ہوئی کہ وقت کے ساتھ سلطانی جمہور کا رنگ اور آہنگ ملک عزیز پر چھا جائے گا۔ آزادی کے ساتھ اپنوں کے ذریعہ اپنوں کے ہاتھوں امور سلطنت سنبھالتے دیکھنا، یقیناً ایسا خوش آئند تجربہ تھا جو نااہل اور ناتجربہ کار ہاتھوں میں بھی کچھ زیادہ ناخوشگوار نہیں لگا۔ لیکن نصف صدی سے زیادہ کی مدت دراز ہونے کے بعد جمہوریت کا تجربہ اب جیسے ایک ناگوار تجزیہ میں بدلتا جاتا ہے۔ اسی جنوری کی خبروں میں نفرت انگیز تقریروں پر عدالت میں بحث، پھر عدلیہ کی خود مختاری اور انتظامیہ کا کردار، حکمراں جماعت کا اصل مقصد عقیدہ نہیں کاروبار، دراندازی کے الزامات، زہریلے پانی کا سیاسی زہریلے ماڈل، انتخابات میں مار کرپن اور آسانی سے سیاہی مٹ جانے کا عمل، اڈیشہ میں پادری کو گوبر کھلایا جانا اور مسلم نوجوان کا پیٹ پیٹ کر قتل کیا جانا، مسجدوں، مزاروں کی شکست وریخت، ایس آئی آر پر سپریم کورٹ کی الیکشن کمیشن کو تنبیہ، کرنل صوفیہ قریشی پر سپریم کورٹ کے ذریعہ حکومت کی سرزنش، فضائی آلودگی سے سالانہ دس لاکھ موتیں جیسی خبریں، اخباروں کے پہلے صفحہ کو جدید شہر آشوب میں ظاہر کرتی رہیں اور ماہ جمہوریت کی داغدار تصویر کشی سے گویا ایک نئے قومی سوالنامہ کی ضرورت بھی پیش کرتی رہیں۔

***

ایسے میں اگر جمہوریت کے وہ معانی ومطالب اوروں کے ساتھ خود کو بھی آواز دیں تو تعجب کیا جو جمہوریت کے تعارف میں گونجتی رہتی ہیں کہ جمہوری حکومت کی بنیادی شناخت تو یہ ہے کہ ہر شخص کو رائے دہندگی کا برابر کا حق حاصل ہو اور اس حق کو بروئے کار لانے میں ماحول بھی جمہوری ہو۔ جمہوری ماحول میں اگر آزادی گفتار، آزادی اظہار نہیں تو پھر خوف اور دہشت سے پیدا ہونے والی غلامی اور مجبوری کی کیفیتوں کو ظاہر ہونے سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔ عدالتوں کا وجود اگر آزاد عدالتی نظام سے اور ایسے بے لاگ منصفوں سے محروم ہونے لگے جو خود اپنے فیصلے کر سکیں نہ کہ ایسے فیصلے جو حکومت ان سے صادر کرانا چاہے تو پھر جمہوریت کے جسد کو بے روح ہونے سے

کون روک سکتا ہے؟ جمہوریت کی سب سے مضبوط بنیاد، قانون کی حکمرانی ہے۔ جس کا مطلب یہی بتلایا جاتا ہے کہ حکومت خود ان قانونوں کی پابند ہو۔ جمہوری اور غیر جمہوری طرز حکومت میں فرق صرف قانون کی عملداری کا ہے اور اس رویہ کی مخالفت کا ہے کہ حکومت اپنے شہریوں سے معاملات برتنے میں خود کو کسی قانونی ضابطے کی پابند نہ سمجھے اور نہ کسی قانونی نظام کی حدبندیوں کی قائل ہو اس طرح شہری پوری طرح حکومت کے رحم و کرم پر ہوں کہ وہ جو سلوک چاہے روا رکھے۔ جب رویہ اس طرز فکر کا ہو تو پھر جمہوریت کی روح یعنی نمائندہ حکومت کی زندگی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ سوال تب یہ اٹھتا ہے کہ جمہوریت میں کون سے کام کرنے کی صلاحیت، حکومت کرنے والوں کے لیے ہونا ضروری ہے؟ اس میدان کے ماہرین متفق ہیں کہ سب سے بڑی صلاحیت معاشی سردبازاری سے ملک کو بچائے رکھنا اور بڑے پیمانے پر بے کاری نہ پھیلنے دینا ہے۔ یہ کسی بھی حکومت اور خصوصاً جمہوری حکومت کے لیے لازمی صفت ہے ورنہ پھر وہ زندہ اس لیے نہیں رہ سکتی کہ عوام بڑے پیمانے کی بے کاری اور بے روزگاری کو دیر تک برداشت نہیں کرسکتے۔ ایک مفکر کی نگاہ میں اصل نکتہ یہی ہے کہ سردبازاری کی نوبت نہ آئے ورنہ اگر معاشی پالیسی احمقانہ ہو جائے تو جمہوریت زوال اور خاتمے کے مرحلے طے کرنے لگتی ہے۔ ایک صدی قبل فاشسٹ جرمنی کی بربادی کا بڑا سبب یہی تھا اور یہی وہ مقام بھی ہے جہاں اندیشہ اس بات کا ہونے لگتا ہے کہ جمہوریت کہیں آمریت کی غلامی میں نہ بدل جائے۔

***

ملک میں برسر اقتدار حکومت سے حزب مخالف کا اختلاف جمہوریت کی ایک قابل تحسین خوبی ہے لیکن اگر اختلاف، بے اعتباری اور بے اعتمادی میں بدل جائے تو یہ جمہوریت کی زندگی ہی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ حقیقتاً جمہوریت ہم خیال شہریوں کو یک جا اور متحد ہونے کا موقع دیتی ہے اور اس عمل کو پسندیدہ بناتی ہے کہ اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں برسرعام مقدمہ چلائے جانے کا حق اس طرح ہو کہ اس عمل میں پہلے ہی گرفتار ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ اور یہ بات بھی کہ وسیع حدبندیوں کے دائرے ہوتے ہوئے بھی ایک شہری کو یہ اجازت بلکہ ضمانت ملے کہ وہ اپنے حق کے لیے کچھ کہہ سکتا ہے، لکھ سکتا ہے اور شایع کرسکتا ہے۔ بات کرنے کی آزادی، باتیں کرنے کے لیے جمع ہونے کی آزادی، قانون کے ذریعہ عدل وانصاف کے حصول کی آزادی، ان ہی سے آزاد جمہوریت کی بقا ہے۔ جشن جمہوریت پر ایسے شکوہ آمیز خیالات کے لیے معذرتاً کہہ سکتے ہیں کہ:

جیسی اب ہے تری محفل، کبھی ایسی تو نہ تھی

***

دارالمصنفین کے کتب خانے میں نئی کتابیں برابر شامل ہوتی رہتی ہیں، ان میں زیادہ حصہ ان کا ہوتا ہے جو برائے تبصرہ ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی بعض حضرات اپنی یا اپنے اداروں کی مطبوعات سے بھی خاص طور پر کتب خانہ کو نوازتے رہتے ہیں۔ گذشتہ دنوں جناب اسامہ منصور منیجر مرکز السلام التعلیمی والخیری کی جانب سے ڈاکٹر عائض القرنی کی اسوۃ العالم کا اردو ترجمہ اور شیخ الکل سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی، علامہ محمد رئیس ندوی حیات وخدمات سمیت کئی کتابیں موصول ہوئیں، اسی طرح سید نظامی اشرف نے مناقب السادات، قوت الفواد، النور المنزہ، اشرف الاربعین اور دی گریٹ محمدؐ کتابیں ہدیہ کیں۔ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ دینیات کے فعال اور نیک نام صدر پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے تو قریب اٹھائیس کتابوں کے تحفے سے جذبات ممنونیت کو گراں بار کر دیا۔ کتب خانہ دارالمصنفین ان علمی ہدایا وتحائف کے لیے بے حد شکر گذار ہے۔

***

افسوس ۱۳؍ جنوری کو ڈاکٹر منظور عالم اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کے بانی اور اس سے بھی زیادہ ایک معتدل و متوازن اسلامی دانشور کی حیثیت سے انہوں نے احترام، عزت اور مقبولیت کی دولت پائی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دوراندیشی اور فہم زمانہ کی خوبیوں کی مثال تھے۔ وہ مدھوبنی بہار میں ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کیا، اپنی شاندار علمی اور عملی خصوصیات کی وجہ سے وہ بیرون ملک بھی بلائے جاتے رہے۔ ان کی زندگی کی درخشانی کثیر الجہات تھی۔ کئی تعلیمی وعلمی وسماجی ادارے اور بقول شخصے ایک ہزار سے زیادہ سمیناروں کا انعقاد ان کی عملی زندگی کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت ہے۔ ملی کونسل جیسی کل ہند تنظیم ہو یا فقہ اکیڈمی جیسا موقر فقہی ادارہ، ہر جگہ ان کی مثبت فکر، ان کی ضرورت اور افادیت کا احساس دلاتی رہی۔ واقعی ان کی رحلت سے ملت کی فکری قیادت میں ایسا خلا پیدا ہو گیا جو شاید مدتوں ان کی سی شخصیت کا انتظار کرتا رہے گا۔ ان کی گفتگو میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے عجب تڑپ نظر آتی تھی، اسلام کے حوالے سے وہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، ان طبقات کے لیے بھی دردمند رہتے تھے جن کو پس ماندہ، دلت، کمزور اور بے مایہ جیسی تعبیرات سے یاد کیا جاتا ہے۔ دارالمصنفین کے لیے بھی ان کی فکرمندی، ان کی باتوں سے ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، ملک و ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور اپنی رحمتوں کے سایہ نصیب فرمائے۔ آمین

***

ملفوظات نگاری: نثری اظہار کا غیر افسانوی بے صنف نقش

پروفیسر مجید بیدار
سابق صدر شعبۂ اردو ، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد
majeedbedar@gmail.com

اردو کی ادبی تاریخ کے پس منظر میں نثر کے انفرادی انداز کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسے ابتدائی نوعیت کی نثر کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ عالمی سطح پر عربی اور فارسی زبان میں ملفوظات کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں فارسی ملفوظات کے درمیان اردو کے علاوہ دکنی فقروں اور جملوں کی موجودگی سے اس دور کی تاریخ میں ملی جلی زبان کے اثرات کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں ملفوظات تحریر کرنے کا چلن عام رہا۔ عربی زبان سے اردو میں منتقل ہونے والے مفرد لفظ ملفوظ کی جمع کی حیثیت سے ملفوظات کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ ملفوظات عربی زبان میں ایسے مقولوں اور تحریروں کو کہتے ہیں جن کے ذریعے روحانیت اور فکر کی گہرائی ظاہر کرتے ہوئے تجربات اور مشاہدات کو ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے۔

ملفوظہ درحقیقت زریں اقوال کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو زبان میں ادب کی شروعات سے بہت پہلے یہ زبان بول چال کی زبان کی حیثیت سے شہرت رکھتی تھی۔ اس دور میں کئی زبانوں کے الفاظ کو بول چال کی زبان میں شامل کیا جاتا رہا ہے، جس میں شمالی اور جنوبی ہند کی آریائی اور دراوڑی زبانیں شامل تھیں۔

فارسی ملفوظات میں اردو فقروں اور جملوں کے استعمال کی وجہ سے ہندوستانی ملفوظات کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ فیروز اللغات میں ملفوظات کو مذکر کہا گیا ہے اور اس کا معنی باتیں یا گفتگو کرنا بتایا گیا ہے۔ ملفوظات کو قواعد کے اعتبار سے لفظ ملفوظ کی جمع کا موقف حاصل ہے، جسے طرزِ نثر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

روحانیت کو پیش کرنے کے لئے خاص نثر کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اردو زبان کے آغاز کے نظریے کی شناخت بآسانی ملفوظات سے ہو سکتی ہے۔ ملفوظات میں موجود مواد اور اس کی لفظیات میں موجود ہم رنگی فارسی زبان کے درمیان ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے لسانی نقوش کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں تحریر کردہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کی جانب سے اخلاق کو سدھارنے اور روحانی زندگی کے مدارج ثابت کرنے کے لئے پیش کردہ اقوال کو ملفوظات کا درجہ حاصل ہے۔

اولیائے کرام نے جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس ملک کے مقامی باشندوں سے ربط و تعلق کے نتیجے میں فارسی اور عربی زبان کے درمیان مقامی زبانوں کے استعمال پر خصوصی توجہ دی۔ ہندوستان میں فارسی ملفوظات کے دوران ہندوستان کی مقامی زبانوں کے الفاظ کے اشتراک کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی میل جول کی وجہ سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے تعین کے ابتدائی دور میں ملفوظات کی لسانی اہمیت کا ثبوت ملتا ہے اور ان ملفوظات کے توسط سے ہندوستان کی طرزِ معاشرت کے دوران دو قوموں کے باہمی اتحاد اور یکجہتی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ملفوظات کی اہمیت اور ان کے ذریعے نمایاں متن کے باہمی اشتراک سے اردو زبان کی شروعات کا ثبوت ملتا ہے۔ اردو کے بیشتر تاریخ نویسوں میں حافظ محمود شیرانی، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زؔور کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے پاکستان کے مورخین اردو نے بھی ہندوستانی ملفوظات سے استفادہ کے نتیجے میں اردو زبان کی تاریخ مدون ہونے کی دلیل پیش کی ہے۔ تاہم ملفوظات جیسی صنفِ نثر میں اس کی اسلوبی خصوصیت کے بارے میں وضاحت نہیں کی گئی۔ اس لئے ملفوظات کے طرز اور اس کے علمی و ادبی ہی نہیں، بلکہ فنی انداز کو واضح کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ ملفوظات کے دوران بیانیہ کے انداز کے بجائے وضاحت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح ملفوظات کو غیر افسانوی نثر اور وضاحت کی علمبردار نثر قرار دیا جاتا ہے۔ ملفوظات کے فنی عوامل کا جائزہ ملاحظہ ہو:

> صوفیہ اور اولیاء کی زبان سے جو فقرے اور جملے نکلتے ہیں، انہیں ملفوظات کہتے ہیں۔ ملفوظہ میں ان کے ہادی حضرت سید محمد جونپوری کے اقوال کو فراحین کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس زمانہ

میں اردو زبان کی ابتداء ہوئی تھی، اس دور میں باقاعدہ نثری تصانیف موجود نہ تھیں۔ اس وقت نثر میں جو کچھ مل جاتا، اسے بساغنیمت سمجھا گیا۔ صوفیا میں سے اکثر کی گفتگو فارسی میں ہوتی ہوگی۔ انہوں نے جب کبھی کوئی جملہ یا فقرہ اردو میں کہہ دیا اور وہ ہم تک پہنچ گیا، اسے اردو نثر کی تاریخ سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہے۔ صوفیا کے ملفوظات کے مجموعے اور سوانح عمریاں فارسی میں لکھی ہوتی ہیں۔ شاذ و نادر ان میں دو چار اردو ملفوظات مل جاتے ہیں۔ فارسی میں بھی ان کے جو اقوال ہیں، ان میں سے بھی کئی کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ اردو میں رہے ہوں گے اور جامعِ ملفوظات نے انہیں فارسی میں ترجمہ کر کے لکھ دیا ہے۔
فارسی میں ملفوظات اور سید اولیاء کی کتابیں بڑی تعداد میں ہیں۔ ان میں جو اردو ملفوظات ملتے ہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ خود ایک اہم باب قرار پائے گا۔ اس لئے یادداشت کے لئے ایک بار پھر ان مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن میں متعلقہ بزرگوں کے ملفوظات مل جاتے ہیں۔
ذیل کی فہرست میں مجموعہ ملفوظات کے علاوہ سیرت اور تاریخ کی متعلقہ کتابوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔[۱]

مشرقی ممالک کی زبانوں میں چند زبانیں ایسی ہیں جو سیدھی جانب سے بائیں جانب لکھی جاتی ہیں۔ جبکہ کئی زبانیں بائیں جانب سے سیدھی جانب لکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ زبان لکھنے کا تیسرا طریقہ ریاضی کے اعداد لکھنے کی طرح یعنی اوپر سے نیچے لکھنے کا انداز ہے۔ عالمی سطح پر نثر کا کونسا وصف سب سے زیادہ اولیت کا درجہ رکھتا ہے اور اس کے ذریعے کس قسم کے افکار کی نمائندگی ممکن ہو سکی، اس کے بارے میں کسی قسم کا نتیجہ اخذ کرنا سخت دشوار ہے۔ لیکن مشرقی زبانوں کے توسط سے اولیت کی نمائندگی کے لئے جس قسم کی نثر کو فروغ حاصل ہوا، اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے نثر کے خالص اخلاق اور مذہبی انداز کو عام شہرت حاصل ہوئی۔ اس نثری انداز کو "ملفوظات" کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔
جس طرح پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی کہی ہوئی باتوں کو "حدیث" کا درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے علاوہ اہل اللہ کی کہی ہوئی باتوں کو تحریر کرنے کا

---

[۱] سیدہ جعفر، تاریخ ادب اردو، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، جلد پنجم، ص: ۴۰۱

عمل "ملفوظات" کہلاتا ہے۔ عرب کی سرزمین سے لے کر ایران اور افغانستان کے علاوہ ہندوستان اور اس کے شمالی اور جنوبی حصوں کے ادبی اور مذہبی کارناموں پر تحقیقی توجہ دینے سے واضح ہو جاتا ہے کہ عرب کی سرزمین سے وابستہ عبرانی اور عربی کے علاوہ ہندوستان اور ایران کے علاقوں میں فارسی زبان کے توسط سے جس طریقے کو روایت کے ساتھ ترقی کا موقع ملا، اسے ملفوظات کہا جاتا ہے۔ علمی اور ادبی انداز سے ملفوظات کو صنف کی حیثیت سے پیش کرنا مناسب نہیں ہے، اس لئے تحقیقی طریقۂ کار کے پس منظر میں اس کی شناخت کی جائے گی، تاکہ تاریخی حیثیت سے جواز پیدا کیا جائے۔ نثر کے اس انداز پر تحقیقی کام پر خصوصی توجہ نہیں دی گئی۔ پروفیسر گیان چند جین نے اردو کی ابتدائی نثری کوششوں کے تجزیے کے دوران ملفوظات کے نثری انداز کی حمایت کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ملفوظات کی حیثیت سے دستیاب ہونے والی کتابوں اور ان کے تعارف کے ذریعے اظہاری رویہ کا اندازہ ہوتا ہے، جس کی تفصیلات اس طرح درج ہیں:

صوفی	ایسی کتابیں جن میں ان کے ملفوظات ملتے ہیں
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ	جواہر فریدی، تاریخِ فرشتہ
حضرت بابا فرید شکر گنجؒ	جواہر فریدی، سیر الاولیاء، جواہر خمسہ، افکارِ چشتیہ
حضرت مخدوم جہانیاںِ جہاں گشتؒ	اورادِ امام الدین راجگیری
حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ چراغ دہلی	خیر المجالس، تاریخِ فرشتہ
حضرت صدر الدین کلیم	صحائف السلوک
حضرت علی مولاؒ	خیر المجالس
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	سیر الاولیاء، فوائد الفواد
حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ	عشق نامہ، جوامع الکلم
حضرت حمید الدین ناگوریؒ	اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام

حضرت زین الدین داؤد شیر ازیؒ خلد آبادی	مر غوب القلوب
حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ	معدن المعانی، ارشاد السالکین، شرحِ آداب المرین
حضرت شاہ کوچک ولیؒ	تاریخ بیڑ
حضرت خواجہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ	لطائفِ اشرفی
حضرت قطب عالمؒ	جمعاتِ شاہیہ، مر أۃِ احمدی۔ مر أۃِ سکندری یا تاریخ سکندری، تحفۃ الکرام
حضرت بہاء الدین باجنؒ	خزانۂ رحمت
حضرت سید محمد جونپوری	تاریخ سلیمانی، شواہد الولایت
حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ	مقصود المراد
حضرت شاہ وجیہہ الدین علویؒ	بحر الحقائق، ملفوظِ شاہ وجیہہ الدین
حضرت شاہ ہاشم حسینی علویؒ	مقصود المراد[۲]

ملفوظات سے تاریخی حقیقت اور اس کی ابتدائی خصوصیات کی نمائندگی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود فنی اعتبار سے ملفوظات کی شناخت اور تکنیک کے بارے میں محققین اور ناقدین کے جائزوں کا پتہ نہیں چلتا، جس کی وجہ سے اس نثری تحریر کی تحقیقی، تنقیدی اور علمی خصوصیات کا تجزیہ نہ ہو سکا۔ تاریخی اعتبار سے صوفیہ اور بزرگوں کے اقوال تحریر کرنے کو ملفوظات کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس نثری انداز کا محاکمہ کرتے ہوئے مختلف بزرگوں اور اولیاء کے کہے ہوئے جملوں اور فقروں کے علاوہ کہاوتوں کو ملفوظات کی حیثیت سے شناخت دی ہے۔ ملفوظات کی اصطلاح اور اس کی صنفی خصوصیت کے جائزے پر توجہ دیتے ہوئے سلیم شہزاد نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

> صوفیوں، سنتوں کے اقوال، پند و نصائح اور راحکام وغیرہ کا مجموعہ خصوصاً کسی عارف باللہ کے اقوال، جو اس کے عقیدت مند نے خود عارف کی زبان سے سنے اور انہیں قلم بند کر لیا ہو مثلاً،

---

[۲] سیدہ جعفر، تاریخ ادب اردو، جلد پنجم، ص: ۴۰۲-۴۰۳

خواجہ بختیار کاکیؒ کے ملفوظات شیخ فرید الدین گنج شکرؒ نے (فوائد السالکین)، شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے (راحت القلوب) اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات امیر حسن اعلیٰ سجزی نے (فوائد الفوٴاد) مرتب کئے ہیں۔[۴]

ملفوظات کے لغوی معنی اور اس میں پیش کئے جانے والے متن یا مواد کے علمی و ادبی پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ زبان سے ادا کی ہوئی وہ گفتگو جو کسی پیر، فقیر یا اہل اللہ کی جانب سے کسی خاص کیفیت یا عام حالت میں ادا ہو جائے، جسے ہو بہو نمائندگی دی جائے تو اس انداز کی تحریر کو ملفوظات کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ عربی زبان سے اردو میں منتقل ہونے والا یہ لفظ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے علاوہ خدا کی راہ میں خود کو مختص کر دینے والے افراد کے ناظرہ بیانات پر مشتمل ہوتا ہے، جسے تحریری انداز میں پیش کرنے والا کوئی مرید یا شاگرد ہوتا ہے۔ روحانیات سے وابستہ ایسے افراد جنہوں نے خدا ترسی اور خدا پرستی میں زندگی گزارنے کا حق ادا کیا ہو اور مقصدی طور پر دنیاداری سے زیادہ آخرت سنوارنے کی طرف توجہ دینے پر مائل ہوں، ایسے افراد کے پیش کردہ جملے یا فقرے یا پھر بیان کی ہوئی باتوں کو ملفوظات کی حیثیت سے شناخت دی جاتی ہے۔ انگریزی زبان میں ملفوظات کے متبادل کے طور پر استعمال ہونے والا لفظ Gospel انتہائی اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ عام طور پر عیسائی مذہب کے پادریوں میں عیسائی مذہب کے کسی عقیدے اور شرعی معاملے میں اختلاف کی گنجائش پیدا ہو جاتی تھی تو وہ ایک پادری اپنے ہم منصب دوسرے پادری سے تحریری طور پر مسئلے کے حل کو تلاش کرنے کے لئے جس قسم کی خط و کتابت پر توجہ دیتا تھا، اس روش کے لئے Gospel کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انگریزی زبان میں Godliness کے متبادل کے لئے اردو میں تقویٰ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انگریزی زبان میں Godly کی اصطلاح کے لئے اردو میں متقی، مذہبی، نیک اور عبادت گزار کے معنی ادا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ خدا کی خصوصیت یا دیوتا جیسی صلاحیتوں کی نمائندگی کے لئے انگریزی میں Godlike کی اصطلاح کا چلن عام ہے۔ اس پس منظر میں عبادت کے لائق خدا یا

---

[۴] سلیم شہزاد، فرہنگ ادبیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۴۴۷

God کی بندگی اختیار کرنے کے طریقے کے لئے اس اصطلاح کا استعمال ہو تارہا ہے۔ عربی زبان سے اردو میں منتقل ہونے والی یہ اصطلاح فارسی زبان و ادب کے توسط سے ہندوستان میں فروغ کا ذریعہ بنی۔ عربی اصطلاح "ملفوظات" کو صیغۂ جمع میں استعمال کیا جاتا ہے، جس کی معنوی حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ خداترس اور اللہ والے انسان کی کہی ہوئی باتیں مادّیت کے بجائے روحانیت پر توجہ کا مرکز ہوتی ہیں۔ انہیں نقل کرنا ہی ملفوظات کے دائرے میں شامل ہے۔ ملفوظات کی انگریزی متبادل اصطلاح کے لئے gospel کو رواج دیا گیا، جس سے معنویت اور حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب میں اردو نثر کی ابتدائی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اس طرز کو اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> واضح ہو کہ جب اردو میں نثر کے رسالے اور کتابیں ملنے لگیں، تو اردو نثر کی تاریخ میں ملفوظات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ جن بزرگوں کی جامع نثری تحریریں ملتی ہیں، ان کے منتشر ملفوظات کو بھی تاریخِ ادب میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس طرح ملفوظات کی ادبی اہمیت قطعی نہیں، ان کی اہمیت اردو کے لسانی مطالعے کے لئے نیز اردو نثر کی خشتِ اوّل کے طور پر قائم ہے۔

"تاریخ ادبیات مسلماناں" میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے قدیم اردو نثر میں ایک صنف "قول" کے نام سے قائم کی ہے۔ اور اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> قول ملفوظہ سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی بنیادی اُصولی بات ہوتی ہے۔ ایسی بات جو پند و نصیحت اور راہبری اور راہنمائی کے طور پر ہر دور اور ہر شخص کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ بعض اقوال تو محض ایک آدھ جملے یا شعر پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے ہزاروں باتوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ غوث محمد گوالیاریؒ کا یہ کہنا کہ "بھیگی بچہ خدا کو نہ میلے" ایک جملہ پر مشتمل ایک قول ہے، جو زماں و مکاں سے آزاد اپنے اندر بنیادی صداقت رکھتا ہے۔ (۴)

(۴) ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم: تاریخ ادبیاتِ مسلماناں، چھٹی جلد، ص:۱۱۹

ملفوظے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ وہ کوئی بھی بات ہو سکتی ہے، جس کی کوئی آفاقی اہمیت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر قول سے ان کی مراد ضرب المثل جیسے ملفوظات ہیں تو باقاعدہ نثری تحریروں سے پہلے کے ملفوظات میں اس قسم کے نصیحت آمیز یا دائمی صداقت جیسے اقوال نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اردو زبان وادب کی تاریخ میں قول کا ملفوظے سے الگ کوئی گروہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔[۵]

ملفوظات کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے کوئی آفاقی حقیقت منظر عام پر نہیں لائی جاتی، بلکہ انسان اور دنیا ہی نہیں، بلکہ انسانی زندگی کو مذہب، اخلاق، تہذیب اور شائستگی کے علاوہ حد درجہ ہمدردی اور ملنساری سے وابستہ کرنے کے لئے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے پیش نظر جن خصوصیات کو اہمیت دی جاتی ہے، اگر انہیں احوال کے انداز سے بیان کیا جائے تو اسے ملفوظات میں جگہ دی جاتی ہے۔ غرض ملفوظات کسی نہ کسی انداز کے اقوال سے مربوط ہیں، جو ایک فقرہ یا مصرعہ پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے سلیم شہزاد نے اہم حقائق کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> اقوالِ زریں: الہامی کتابوں، پیغمبروں، صوفیوں، سنتوں، مفکروں، ادیبوں اور رہنماؤں کے وعظ ونصیحت اور اخلاقی واصلاحی خیالات پر مبنی اقوال جو ایک مختصر جملہ کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ایسا ہر جملہ قول یا مقولہ کہلاتا ہے۔ ہندی مرادف: بچن۔[۶]

اس اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی بھی اہم سیاسی، سماجی یا پھر معاشرتی ہی نہیں، بلکہ سائنسی طور پر اہمیت رکھنے والے شخص کے اہم خیالات کو اقوالِ زریں قرار دیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے علاوہ تابعینؒ و تبع تابعینؒ میں شامل تمام مرد وخواتین کے پیش کردہ جملوں کو بھی اقوالِ زرّیں کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے حتیٰ کہ کسی سائنسداں یا سیاسی شخصیت کے پیش کردہ خیالات بھی اقوالِ زریں کی فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن انہیں ملفوظات کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ ملفوظات کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ پیش کرنے

---

(۵) سیدہ جعفر، تاریخ ادب اردو، جلد پنجم، ص:۴۰۳

(۶) ماخذ سابق، ص:۱۲۶۔

والے شخص کا معتبر اور متقی ہونا ہی ضروری نہیں، بلکہ اس کی کہی ہوئی باتوں کو تحریری طور پر کوئی دوسرا نقل کرنے کا حق بھی ادا کرے تو ایسے اقوال کو ملفوظات کا درجہ حاصل ہو گا، جبکہ اقوالِ زریں کو کسی بھی کتاب سے اکٹھا کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقوالِ زریں کو ملفوظات کی حیثیت سے شناخت نہیں دی جاسکتی، بلکہ ملفوظات کا انداز اقوالِ زریں سے مختلف ہے۔ اردو کی لغات میں اس لفظ کے متبادل اصطلاحی رویہ کو اہمیت نہیں دی گئی۔ تاہم حد درجہ قدیم اور ۱۹۶۳ء میں شائع شدہ ”دی اسٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری“ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی کے الفاظ کے معنٰی انگریزی میں ظاہر کرنے والی لغت رام نارائن بینی مادھو، الٰہ آباد نے شائع کی ہے۔ اس کے صفحہ ۵۹۳ پر ملفوظات کے انگریزی معنی Utterances یا پھر Sayings تحریر کئے گئے ہیں۔ ان دونوں انگریزی الفاظ کے معنی وہی سمجھے جائیں گے جو اردو میں اقوالِ زرّیں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ غرض یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ملفوظات کو اقوالِ زریں کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ملفوظات کے لئے ضروری ہے کہ کوئی اہلِ دل، اہلِ صفا اور اہل اللہ انسان اپنے تجربات اور انکشافات کو روحانی افکار کے پس منظر میں بیان کرے اور کوئی دوسرا شخص اسے تحریر کرے۔ اس طرح ملفوظات اور اس کی تاریخی ہی نہیں، بلکہ مذہبی اور ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس انداز کے ملفوظات کی دلیل ملاحظہ ہو:

> عہدِ قدیم میں صوفیائے کرام کے ایک یا دو جملوں کے متعدد اقوال ملتے ہیں، انہیں ملفوظات کہا جاتا ہے۔ ملفوظات کے متعدد مجموعے ملتے ہیں۔ ان میں فارسی زبان میں بیان کردہ واقعے میں مرشد کی زبان سے ایک دو جملے نکلتے ہیں۔ اگر یہ جملے اردو میں ہیں تو یہ ہمارے کام کے ہیں اور ہم انہیں اردو ملفوظ کہیں گے۔ ملفوظات کو ایک ادبی صنف کہنے کا کوئی جواز تو نہیں۔ لیکن چونکہ یہ کافی تعداد میں ہیں (سو سے اوپر ہی ہوں گے) اور قدیم نثر سے مخصوص ہیں، اس لئے ان کے زمرے کو ایک قدیم نثری صنف کا مرتبہ دیا جا سکتا ہے۔ ملفوظے اس قسم کے ہیں:
>
> شیخ فرید شکر گنج: پونوں کا چاند بھی بالا ہے۔
>
> حضرت قطبِ عالم: لوہا ہے، لکڑی ہے کہ پتھر ہے۔

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند میں ڈاکٹر الف-د- نسیم نے ملفوظہ کے ساتھ قول کو ایک

علحدہ صنف کے طور پر پیش کیا ہے۔ انہوں نے دونوں کے درمیان فرق اس طرح کیا ہے:

قول، ملفوظہ سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی بنیادی اُصولی بات ہوتی ہے۔ ایسی بات جو پند و نصیحت اور راہبری اور راہنمائی کے طور پر ہر دور اور ہر شخص کے لئے مثالِ راہ بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر شیخ محمد غوث گوالیاری کا یہ کہنا کہ 'بھیگی بچہ خدا کو نہ میلے'، ایک جملے پر مشتمل قول ہے، جو زماں و مکاں سے آزاد اپنے اندر بنیادی صداقت رکھتا ہے۔ لیکن شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی یہ بات کہ 'میں کہاں یا کدھاں ریاضت کیتی' ایک ملفوظہ یا محض ایک ہندوی فقرہ ہے، اس کی کوئی آفاقی اہمیت نہیں۔ (۷)

وہ نثری اقوال کی یہ مزید مثالیں دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

عارف اس سے کہویں جو خدا سوں بھریا ہووے (شیخ وجیہہ الدین گجراتی)۔

بھاکری پکانا مشکل ہے (شاہ مجذوب برہان پوریؒ)۔

ملفوظے کو ایک صنف کہنا محل نظر ہے۔ اس سے مماثل ایک اور صنف "قول" کارِ زائد ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ملفوظے کی دو ذیلی اقسام کر لی جائیں۔ ایک وہ جن میں معمولی روز کی بات چیت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جن میں زیادہ با معنی اور اہم تر مفہوم ہوتا ہے۔ (۸)

ڈاکٹر گیان چند جین اردو کے اہم محقق اور نقّاد ہیں، جنہوں نے اردو میں نثر کے انداز میں لکھی جانے والی تحریری خصوصیات پر توجہ دیتے ہوئے ملفوظات کے تجزیے کا احاطہ کیا اور اس کی فنی اور صنفی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ملفوظات اردو نثر کے ابتدائی فقروں کی نشاندہی کے غماز ہیں۔ چنانچہ اردو زبان کی ابتداء کے دوران فارسی کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا۔ گیان چند جین کی رائے میں ملفوظات کو نثری صنف کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ ملفوظات کو اقوال کی حیثیت سے قبول کرنا ضروری نہیں۔ کسی بھی قول کے لئے عالمی، مقامی، مادی یا روحانی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہونا ہی اس کی شناخت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ چند اقوال اور اہم فقرے اور جملے پیش کرنے پر اس انداز کو صنفِ نثر کا درجہ دینا مناسب نہیں۔ تاہم فارسی نثر میں لکھے جانے والے ملفوظات کو اردو زبان و ادب میں تاریخی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔

---

(۷) لاہور، ۱۹۷۱ء، جلد ششم، ص: ۱۱۹:

(۸) گیان چند جین، ادبی اصناف، گجرات اردو اکیڈمی، گجرات، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۲۲-۱۲۳۔

عام طور پر صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے اقوال کے دوران فارسی سے مربوط ہندوستانی زبانوں سے میل کھانے والے تراکیب ملفوظات کی شناخت کا وصف رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین میں اس ملک کی مقامی زبانوں میں سنسکرت کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس کے بعد آریائی اور دراوڑی زبانوں کی لفظیات اور امتزاج سے اس ملک کے مختلف علاقوں میں کئی زبانیں فروغ پانے لگیں۔ اس طرح مقامی زبانوں کی محدود خصوصیات کو لامحدود بنانے میں مسلمان بزرگانِ دین اور اولیائے کرام ہی نہیں، بلکہ صوفیا و مشائخ کے کارنامے ملفوظات کی حیثیت سے شہرت کے حامل ہیں۔ ان کے ذریعے روحانیات، عالمی فکر اور پند و نصائح کے موضوعات کو بے ساختہ انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔ اس پس منظر میں ملفوظات اور اس کی تاریخی شہادت سے اس طرزِ تحریر کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کے ادبی پس منظر میں ملفوظات کو نثری صنف کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا، لیکن اردو کے ادبی پس منظر میں تاریخ کے حوالے سے اس کی قدامت سے ضرور ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ملفوظات کو ابتدائی نثری کارنامہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور بزرگانِ دین کی جانب سے تبلیغِ دین کے نتیجے میں ملی جلی زبان کے ذریعے جن الفاظ اوراظہار کو ثبوت کا درجہ حاصل ہوا، اسی انداز کے ابتدائی طریقے کی حیثیت سے ملفوظات کی شناخت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمان باشندوں نے اپنی مادری زبان جیسے عربی، فارسی اور ترکی میں اس ملک کی مقامی زبانوں جیسے سنسکرت، دراوڑی اور پالی کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ کے استعمال کا طریقہ اپنایا، جس سے ملی جلی زبان کے اوّلین نقش کی حیثیت سے خاص انداز کی طرزِ تحریر کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں عرب وایران کے علاوہ ترکستان کی زبانوں کے الفاظ کے امتزاج کی وجہ سے وجود میں آنے والا انداز ملفوظات کی حیثیت سے شہرت کا حامل ہوا۔ ہندوستان میں موجود فارسی ملفوظات میں مقامی زبانوں کے الفاظ کے اشتراک سے دو بڑی قوتوں کے باہمی تعلقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اسی لئے ملفوظات کو صرف بزرگانِ دین کے اقوال کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ہندوستان کی زبانوں کے اشتراک کا بہترین مرحلہ قرار دیا جانا چاہئے۔

تجدید علم کلام اور وحدت الوجود: شبلی اور وویکانند کی ہمنوائی

ڈاکٹر نذیر احمد عبدالمجید
خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
nazeermajeed@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی(۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) اور سوامی وویکانند(۱۸۶۳-۱۹۰۲ء) تجدید علم کلام کے باب میں ہم ذوق و ہم مشرب کہے جا سکتے ہیں۔ سوامی وویکانند کا ہندو مذہب میں جدید علم کلام کے حوالے سے وہی مقام ہے جو اسلام میں سر سید احمد خاں اور علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ البتہ سر سید کی بہ نسبت، شبلی اپنی قدیم علمی اور تہذیبی روایت کے تئیں زیادہ وفادار نظر آتے ہیں۔ عقل اور مذہب، ایک فطری مذہب کی تعریف اور جدید علم کلام کی جستجو سے متعلق مباحث میں علامہ شبلی اپنے فکری اسلوب کے لحاظ سے سر سید سے زیادہ سوامی وویکانند کے قریب نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر وحدت الوجود کی سمجھ، جسے وویکانند کسی انسان کے صحیح معنی میں پڑھے لکھے ہونے کا معیار قرار دیتے ہیں، شبلی اور وویکانند میں ایک بڑی قدر مشترک ہے۔ اس تناظر میں شبلی کے فطری مذہب کی بحث کا موازنہ وویکانند کے آفاقی مذہب اور ویدانت کے مباحث سے کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک حیرت انگیز قدر مشترک یہ ہے کہ عام مذہبی مفکرین کے برعکس، یہ تینوں سوشل ڈارون ازم کے الحاد اور مادّہ پرستی سے اپنی بیزاری کے باوجود ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو یکسر مسترد نہیں کرتے۔ سر سید اور شبلی اسے مسلم، اور وویکانند اسے ہندو فکر و فلسفہ کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔[1] وویکانند مزید آگے بڑھ کر اسے ادویت ویدانت (وحدت الوجود) کے حق میں ایک

---

[1] سوانح مولانا روم، مولانا شبلی نعمانی، نامی پریس، کانپور، ۱۹۰۶ء، ص ۸۲، ۱۵۲-۱۵۴، ۲۰۰؛
Qidwai, Sarah, A: "Darwin or Design? Examining Sayyid Ahmad Khan's Views on Human Evolution," in Saikia, Yasmin and Rahman, M. Raisur (2019): *The Cambridge Companion to Sayyid Ahmad Khan,* Cambridge University Press, pp.214- 232; Vivekananda, Swami (2019): *Complete Works of Swami Vivekananda,* vol. 8, Jnana-Yoga VII, p. 21

دلیل قرار دیتے ہیں۔[۲]

خرق عادت اور مذہب کی حقانیت کا معیار: سرسید، علامہ شبلی اور سوامی وویکانند بعض دیگر باتوں میں بھی متفق ہیں۔ مثلاً مذہبی عقائد واحکام کا عقل اور جدید سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہونا، اور خرق عادت یعنی معجزہ کا کسی مذہب (یا نبوت) کی حقانیت کی دلیل نہ ہونا وغیرہ۔ شبلی کے بقول، اس آخری موقف کے اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یورپ میں منکرین مذاہب کا جو گروہ پیدا ہو گیا تھا، اس کے انکار مذہب کی ایک وجہ یہی تھی کہ مذہب میں عقل کی توہین کی جاتی تھی اور خرق عادت کو (جو کہ ایک غیر معمولی صورت حال ہو سکتی تھی) ایک معمول کی بات بنادیا گیا تھا۔[۳]

یورپ اور امریکہ میں قیام کے دوران وویکانند سے، جو وہاں ایک جوگی کی وضع قطع میں ہوتے تھے، عیسائی مشنری چمتکار دکھانے کی فرمائش کرتے تھے جس کے جواب میں وویکانند کہتے تھے کہ یوگ کا مطلب چمتکار نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل مطلب روحانیت ہے جب کہ چمتکار کا مطالبہ ایک طرح کی مادہ پرستی ہے۔ وہ عیسائی مشنریوں کو گوتم بدھ کی مثال سے چپ کراتے، جنھوں نے ایک یوگی کے چمتکار سے برآمد کئے ہوئے پیالے کو اپنے پیروں سے توڑ دیا تھا اور معرفت حق کے لئے چمتکار کے بجائے عقل کے استعمال کی تلقین کی تھی۔[۴] معجزات کے تعلق سے شبلی اور وویکانند کا یہ موقف اس پس منظر میں اہم ہے کہ ان کے مخاطبین مغرب کے وہ معاصر عیسائی مشنری اور مناظر تھے جو نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بلکہ حواریوں کی کرامات، عیسائی سنتوں (Saints) کے چمتکار اور حتیٰ کہ اپنے مشنریوں کی شعبدہ بازیوں کو بھی اپنے مذہب

---

(۲) Vivekananda, Swami (2019): *Complete Works of Swami Vivekananda.* vol. 1, Patanjali's Yoga Aphorisms, p.236; *The Vedanta Philosophy,* p.292; *Reason and Religion,* p. 301

(۳) الخطبات الاحمدیۃ فی العرب والسیرۃ المحمدیۃ، سرسید احمد خاں، تقدیم: محمد علی فارق، ادارہ دعوت القرآن، لاہور ۲۰۰۳ء، ص ۴؛ علم الکلام اور الکلام، علامہ شبلی نعمانی، دوست ایسوسی ایٹس، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۵۰۔۲۵۵؛ سوانح مولانا روم، ص ۱۳۱، ۱۳۹-۱۴۱؛

Vivekananda, Swami (2019): *Complete Works of Swami Vivekananda*, vol. 1, Soul, God and Religion, p. 357

(۴) علم الکلام اور الکلام، ص ۱۸۱

کی حقانیت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ وہ ہندوؤں کے علاوہ، مسلمانوں کو بھی اسی طرح چیلنج کرتے تھے اور قرآن کو اپنے حق میں اور اسلام کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے، کیونکہ قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا تو ذکر کرتا ہے لیکن حضرت محمد ﷺ سے منکرین کے مطالبۂ معجزات کو یکسر مسترد کر دیتا ہے۔

وحدت الوجود اور تعلیم یافتہ مسلمان: وویکانند اس بات سے بہت خوش تھے کہ ہندی تصوف (وحدت الوجود)، جو مسلمانوں کے ایک طبقے میں ہمیشہ مقبول رہا ہے، اس سائنسی دور میں بھی اس کی قدر دانی روزافزوں ہے۔ ان کے معاصرین میں بہت سے جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور انگریز اسپر یچولسٹ تھے جو الحاد اور مادہ پرستی کے مذاق عام کے علی الرّغم اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ شبلی بھی یورپ کے ان معاصر روحانیین سے متأثر تھے جنھوں نے اس دور الحاد میں مذہبی اعتقاد کی شمع جلائے رکھی تھی۔ مغرب کے یہ روحانیت پسند علماء تصوف اور وحدت الوجود کے دلدادہ تھے۔ سوانح مولانا روم میں شبلی وحدت الوجود کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں اور اسے فلسفہ و حکمت اور قرآن کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں:

> وحدت الوجود کے فلسفیانہ مقدمات کو پیش نظر رکھیں تو اسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ فلسفے میں عالم کا قدیم ہونا مسلم ہے اور قدیم کا تعدد ممکن نہیں۔ لہٰذا دو ہی صورتیں ممکن ہیں: یا تو خدا نہیں ہے، یا عالم ہی خدا ہے۔ پہلی صورت کے قائل دہریہ کہلاتے ہیں۔ دوسری صورت حضرات صوفیہ کی ترجیح ہے...... غرض فلسفہ کی رو سے تو صوفیہ کے مذہب کے بغیر چارہ نہیں۔ البتہ یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوص قرآنی اس کے خلاف ہیں۔ لیکن یہ شبہہ صحیح نہیں۔ قرآن مجید میں اس قسم کی آیتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن، اول و آخر جو کچھ ہے، خدا ہی ہے۔ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (الحدید:۳)۔[۵]

اس تعلق سے شبلی مولانا روم کو جدید فلسفہ اور سائنس سے بھی ہم آہنگ پاتے ہیں:

> مولانا (روم) نے عوام کو سمجھانے کے لئے جو تشبیہ دی، آج یورپ کے بڑے بڑے علماء کا وہی مذہب ہے۔ حکمائے یورپ کہتے ہیں کہ عالم میں تین چیزیں محسوس ہوتی ہیں: مادہ، قوت اور

---

(۵) Vivekananda, Swami (2019), *Complete Works of Swami Vivekananda,* vol. 5, India's Mission, p. 242; India and England, p. 247; سوانح مولانا روم، ص ۱۷۹-۱۸۰، ۱۸۲

عقل (وزڈم)۔ یہ عقل تمام اشیاء میں اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح انسان کے بدن میں جان۔ اسی عقل کا اثر ہے کہ تمام سلسلۂ کائنات میں (ایک) ترتیب اور نظام پایا جاتا ہے۔ غرض تمام عالم ایک شخص واحد ہے۔ اور اس شخص واحد میں جو عقل ہے، وہی خدا ہے۔ (بالفاظ دیگر) جس طرح انسان میں ایک ہی عقل ہے، اسی طرح تمام عالم کی ایک عقل ہے۔ اور اسی کو خدا کہتے ہیں۔[۶]

وحدت الوجود اور جدید علم کلام: جس طرح وویکانند نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے وحدت الوجود اور تناسخ (پنر جنم) جیسے عقائد کے "سائنٹفک" ہونے پر استدلال کیا، شبلی نے بھی اسے آخرت کے اثبات کے لئے استعمال کیا۔ شبلی کہتے ہیں کہ آخرت کا عقیدہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ لیکن ایسا اہم مسئلہ علم کلام کی موجودہ کتابوں میں جس طرح ثابت کیا جاتا ہے، اس سے یقین کا پیدا ہونا ایک طرف، فطری وجدان میں بھی ضعف آتا ہے۔ اس کے برعکس، مولانا روم نے، جو شبلی کی نظر میں روایتی متکلمین کے مقابلہ میں ایک زیادہ کامیاب متکلم اسلام ہیں، اس مسئلے کو بہتر طور پر حل کیا ہے۔ شبلی کہتے ہیں کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے تو آخرت کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اصل مسئلہ اس کے استبعاد کا ہے۔ بظاہر یہ نہایت بعید معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب مر کر سڑ گل جائے تو پھر اس کو دوبارہ زندگی حاصل ہو، جیسا کہ عمر خیام نے اپنی ایک رباعی میں کہا ہے کہ انسان کوئی گھاس نہیں ہے کہ ایک دفعہ کاٹ ڈالی جائے تو پھر اگ آئے۔ مولانا روم نے معاد کے استبعاد کو نہایت عمدہ تمثیلوں اور تشبیہوں سے رفع کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسان پہلے جماد تھا، جماد سے نبات ہوا، نبات سے حیوان ہوا، اور حیوان سے انسان ہوا۔

شبلی کہتے ہیں کہ مولانا روم کا یہ نظریۂ ارتقا قرآن سے مستفاد ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ (المؤمنون: ۱۲-۱۴)

مولانا روم کا یہ نظریۂ ارتقا نہ صرف قرآن کے لحاظ سے بلکہ شبلی کے بقول، فلسفۂ حال کے لحاظ سے بھی صحیح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[۶] سوانح مولانا روم، ص ۱۸۴- ۱۸۵

ڈارون کی تھیوری کے موافق انسان پر جمادی، نباتی، حیوانی، سب حالتیں گزری ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ڈارون روح انسانی کا قائل نہیں، اس بنا پر وہ انسان کو حیوانات سے الگ مخلوق نہیں سمجھتا۔ بہر حال جب یہ ثابت ہوا کہ انسان پہلے جماد تھا، جمادیت کے فنا ہونے کے بعد نبات ہوا، نباتیت کے فنا ہونے کے بعد حیوان ہوا، تو اس میں کوئی استبعاد نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حالت بھی فنا ہو کر کوئی اور عمدہ حالت پیدا ہو۔ اور اسی کا نام دوسری زندگی، یا معاد، یا قیامت ہے۔[۷]

علم لدنّی اور تجدید علم کلام: کشف و وجدان یا علم لدنّی شبلی کے اہم موضوعات میں سے ہے۔ علم لدنّی کے تعلق سے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سر سید بھی اس بات کے قائل ہیں کہ تجدید علم کلام کے لئے اس کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اگرچہ شبلی کے برعکس، سر سید کو وحدت الوجود سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ وہ مولانا روم کو جدید علم کلام کی تشکیل میں کوئی مقام دینا چاہتے ہیں جیسا کہ شبلی کے نزدیک انھیں حاصل ہے۔ البتہ وہ علم لدنّی کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ مدّعی بھی ہیں۔ سر سید کہتے ہیں کہ علم کلام کی تجدید ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام اسی سے ہو سکتا ہے جس پر خدا کی مہربانی ہو اور اس نے اس کے دل کو نور ایمان سے منور کیا ہو۔ علاوہ ازیں، یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو کچھ حصہ "علم لدنّی" سے بھی عطا ہوا ہو، جیسا کہ انھیں بفضلہ تعالیٰ حاصل ہے: "وإن من أعظم نعم الله عليّ أن آتاني منه حظا وجعل لي منه نصيبا"[۸]۔

شبلی کے نزدیک کشف یا علم لدنی کی اہمیت اس لئے ہے کیونکہ یہ وحدت الوجود کی حقانیت کی آخری دلیل ہے۔ چنانچہ علم لدنی کا اثبات شبلی کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہے۔ وہ اس کے حق میں نہ صرف امام غزالی اور مولانا روم کے دلائل نقل کرتے ہیں بلکہ حکمائے یورپ کی معاصر شہادتیں بھی درج کرتے نظر آتے ہیں:

> اعتقاد تین طریقہ سے پیدا ہوتا ہے: تقلید سے، استدلال سے (اور) کشف و حال سے۔ پہلی دونوں قسموں کو شریعت کہتے ہیں۔ تیسری قسم کا اعتقاد طریقت ہے۔ یہ اعتقاد سلوک و تصوف اور مجاہدہ و ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ امام غزالی نے اس کی تشبیہ یہ دی ہے کہ مثلاً

---

[۷] سوانح مولانا روم، ص ۸۲، ۱۵۲-۱۵۴، ۲۰۰

[۸] مقالات سر سید، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء، ج ۱، ص ۴۰

ایک حوض ہے جس میں نلوں اور جدولوں کے ذریعے سے باہر سے پانی آتا ہے۔ یہ گویا علوم ظاہری ہیں۔ لیکن خود حوض کی تہہ میں ایک سوت بھی ہے جس سے فوارہ کی طرح پانی اچھلتا ہے اور حوض میں آتا ہے۔ یہ علم باطن ہے۔ یہی علم ہے جس کو علم لدنی اور کشف اور علم غیبی کہتے ہیں۔ [۹]

شبلی کے معاصرین میں کچھ لوگ ایسے تھے جو علم لدنّی کو جب تک کہ وہ تحقیقات جدیدہ سے ثابت نہ ہو جائے، تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ شبلی ان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یورپ میں ایک مدت تک لوگوں کو قطعاً اس سے انکار رہا۔ لیکن جب زیادہ تحقیقات و تدقیقات عمل میں آئیں تو ایک خاص فرقہ پیدا ہوا جس کا نام اسپر یچولسٹ (روحانیین) ہے۔ اس فرقہ میں علوم وفنون جدیدہ کے بہت بڑے بڑے اساتذہ فن شامل ہیں۔ ان لوگوں نے بدیہی تجربوں کے بعد یہ اقرار کیا کہ انسان میں حواس ظاہری و باطنی کے علاوہ ایک اور قوت ہے جو اشیا کا ادراک کرتی ہے اور جو واقعات آئندہ سے بھی واقف ہو سکتی ہے۔ [۱۰]

کشف اور اثبات وجود باری: وجود باری کے اثبات کے لئے اختیار کئے جانے والے مختلف طریقوں میں شبلی اس طریقے کا بھی ذکر کرتے ہیں جسے متکلمین ”نظم کائنات“ یا ”صنعت صانع“ (Argument from design) کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

یورپ کے ملاحدہ آج کل خدا کے وجود پر جو اعتراضات کر رہے ہیں اور جس کی بنا پر ہمارے ملک میں مذہب کی طرف سے بے دلی پھیلتی جاتی ہے، ہم کو صرف ان اعتراضات کا جواب دینا (ہے)۔ (اثبات باری کے مختلف طریقوں میں سے ایک) طریقہ حکماء کا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عالم میں نظام اور ترتیب پائی جاتی ہے۔ اس لئے ضرور اس کا کوئی صانع ہے۔ اس کو ایک مثال میں سمجھو۔ خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی شعر لے لو۔ اس کے الفاظ الٹ پلٹ کر کے کسی معمولی آدمی کو دو۔ اور اس سے کہو کہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے۔ وہ سو سو طرح الٹ پلٹ کرے گا۔ لیکن اتفاقیہ طور سے یہ کبھی نہ ہو گا کہ حافظ اور نظامی کا شعر نکل آئے۔ حالانکہ وہی الفاظ ہیں، وہی حروف ہیں، وہی جملے ہیں۔ صرف ذرا سی ترتیب کا پھیر ہے۔ پھر کیوں کر ممکن ہے کہ نظام عالم جو اس قدر با قاعدہ مرتب اور موزوں ہے، وہ خود بخود قائم ہو گیا ہو۔ قرآن مجید میں خدا

---

[۹] سوانح مولانا روم، ص ۱۷۳-۱۷۴

[۱۰] سوانح مولانا روم، ص ۱۲۵

کے وجود پر اسی سے استدلال کیا (گیا) ہے۔[11]

واضح رہے کہ شبلی نے اسے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ کہا ہے جو کہ حکماء کا ہے۔ البتہ سوامی وویکانند کے نزدیک اثبات وجود باری کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے کشف یا مشاہدۂ حق۔ وہ نظام اور صنعت سے صانع پر استدلال کے اس طریقہ کو بچکانہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس دلیل سے جو خدا ثابت ہوتا ہے، وہ خدا نہیں محض ایک عظیم معمار ہے، اور اس کی عظمت مطلق نہیں، محدود ہے۔ اور وہ بس اتنا ہی عظیم ثابت ہوتا ہے، جتنی کہ یہ کائنات ہے۔ کہتے ہیں:

اگرچہ بے ذوق ووجدان اور بے تجربہ لوگوں کے لئے یہ آخری دلیل ہے، لیکن اس پر بہت طرح کے منطقی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ خدا محدود ہے اور قادر مطلق نہیں۔ (اس کی مثال) ایسی ہے کہ جیسے کوئی عظیم معمار ایک دریا پر پل تعمیر کرے۔ اب اگر وہ عظیم معمار قادر مطلق ہے تو اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اسے اڑ کر یا کود کر دریا پار کر لینا چاہئے۔ اس کی قدرت ہونے کے باوجود اگر وہ ایک حیرت انگیز پل تعمیر کرتا ہے تو یہ ایک کار عبث یا محض اس کا ذوق خود نمائی ہوگا۔ علاوہ ازیں، پل کی تعمیر، خواہ وہ کیسا ہی شاندار اور حکیمانہ ڈیزائن کے ساتھ ہو، خدا کو ایک معمار کی طرح محدود کر دیتا ہے جو اپنی تعمیر (یعنی تخلیق) میں سامان اور ڈیزائن کا محتاج ہے۔ اور یہ دونوں باتیں خدا کی شان کے منافی ہیں۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ کسی کام کا محض ارادہ کرے اور وہ پورا ہو جائے۔ (یعنی کن فیکون)۔[12]

سوامی وویکانند کہتے ہیں کہ اثبات خدا کے لئے اثبات صانع کا طریقہ غیر آریائی (سامی) طریقہ ہے جسے ایک طرح کا عوامی اور بچکانہ طریقہ کہا جانا چاہئے جو خدا کی عظمت، قدرت اور حکمت کو منطقی طور پر محدود کر دیتا ہے۔ اسی منطقی محدودیت سے بچنے کے لئے آریہ ذہن نے کشف کا طریقہ نکالا:

آریہ ذہن نے یہ طریقہ نکالا کہ اس نے خارجی حواس پر تکیہ کرنا موقوف کر دیا اور اندر کی آنکھ کھول لی۔ چنانچہ ایک ہندو رشی خدا کے اثبات کے لئے کہتا ہے: میں نے آتما کو دیکھا ہے، میں

---

[11] سوانح مولانا روم، ص ۱۷۶

[12] Vivekananda, Swami (2019), *Complete Works of Swami Vivekananda*, vol. 6, The Design Theory, pp. 93-94; Vol. 1, *Vedic Religious Ideals*, p.286

نے خدا کو دیکھا ہے (میں نے اپنے نفس کو پہچانا ہے، میں نے اپنے رب کو پہچانا ہے)۔[۱۳]

وویکانند کے نزدیک اثبات خدا کے لئے اثبات صانع کے اس سامی (غیر آریائی) طریقے کی افادیت اسکول کے بچوں (یعنی عوام اور غیر آریہ اقوام) کے حق میں یہ ہے کہ وہ کائنات کی مرئی و محسوس خوبصورتی، شان اور قدرت و حکمت کی مدد سے خدا کی غیر مرئی و غیر محسوس خوبصورتی، شان اور قدرت و حکمت کا کسی قدر ادراک کر سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک عبوری مرحلہ ہے، منزل نہیں۔ منزل مشاہدہ ہے۔ یعنی کشف کے ذریعے مشاہدۂ نفس (آتما) اور پھر مشاہدۂ رب۔[۱۴]

کشف کے ذریعے مشاہدۂ نفس اور پھر مشاہدۂ حق کے اس طریقے کو شبلی مختلف طریقوں میں سے محض ایک طریقہ ہی تسلیم کرتے ہیں، البتہ وویکانند کی طرح وہ بھی اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں: ”نفس کی معرفت خدا کے اجمالی تصور کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر حضرات صوفیہ سب سے زیادہ اسی مسئلہ پر توجہ کرتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه“۔[۱۵]

اس مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اگرچہ دبستان سرسید سے تعلق رکھتے تھے، البتہ وہ سرسید کے مقابلے میں قدیم علمی اور تہذیبی ورثہ کے زیادہ قدر شناس تھے۔ وہ کشف کو عقل کا درجہ دینے یا عقل پر وجدان کو فوقیت دینے میں وویکانند کے ہم مشرب ہیں۔ گویا بقول اقبال، جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی۔ وویکانند کے اس سرسری مطالعے سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ تقابل ادیان کے بڑے ماہر عالم تھے اور اس پر انھیں بجا طور پر فخر بھی تھا، البتہ اسلامی علم کلام سے ان کی واقفیت محض واجبی سی تھی اور بالخصوص قرآن مجید کی تعلیمات سے، جو اس کی بنیاد ہیں، وہ بالکل ہی نابلد تھے۔

---

(۱۳) Vivekananda, Swami (2019), *Complete Works of Swami Vivekananda,* vol. 1, Paper On Hinduism, p.14

(۱۴) Vivekananda, Swami (2019), *Complete Works of Swami Vivekananda,* vol. 1, Vedic Religious Ideals, p.286; vol. 6, The Design Theory, p.93

(۱۵) سوانح مولانا روم، ص ۱۵۱

ہندوستانی ملکائیں و شہزادیاں اور فارسی زبان و ادب

محمد رِضا اظہری (علیگ)

اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ فیکلٹی) شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

azhari.reza110@gmail.com

سلطان محمود غزنوی کے دور میں، جب ایران میں اسلام کا نفاذ بڑھا، فارسی اور تصوف دوش بہ دوش ہندوستان میں داخل ہوئے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد فارسی اور تصوف پایۂ استحکام تک پہنچے جس کے نتیجے میں تقریباً آٹھ سو سال تک فارسی زبان درباری، مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور ادبی زبان کی حیثیت سے رائج رہی۔

ہندوستان کے مغلیہ حکمرانوں کی تاریخ کے عہد بہ عہد مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پورے برّصغیر میں مغلیہ سلطنت کے عظیم حکمراں، شہزادوں اور شہزادیوں سے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ مغل بادشاہوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ مؤرخوں کی نظر سے اوجھل رہا ہو، لیکن ہمارے موضوع پر بہت کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔

تیموری سلاطین رزم اور بزم دونوں میں یکتائے روزگار تھے۔ جس درجہ کے فاتح و کشور کشا تھے اسی درجہ کے علم دوست اور ادب نواز بھی تھے۔ وہ فارسی کے ساتھ ساتھ ترکی زبان میں اور آخری دور کے بادشاہ تو اردو میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کے اندر شعر و ادب کا صاف ستھرا مذاق پایا جاتا تھا۔ وہ نکتہ سنج نقاد بھی تھے جیسا کہ ان کی شاعری نثر اور تذکروں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان کے عہد میں ہنگامہ کارزار کے ساتھ علم و ادب کی محفل بھی گرم تھی۔ ان کا دربار ہر فن کے اصحاب کمال اور علما و شعرا کا مسکن تھا اور ان کی سرپرستی میں بہت سے علمی و ادبی کارنامے انجام پائے۔ سلاطین تیموریہ کی رزمیہ داستانیں تو بہت لوگوں نے بیان کی ہیں، لیکن ان کی انجمن آرائی، علم و ادب سے ان کی دلچسپی اور شعرا و ادباء کی سرپرستی پر کم لکھا گیا ہے۔

مغلیہ سلطنت میں ایک معمول تھا کہ کسی بھی حال میں شام کے وقت دیوان خانوں میں کافوری شمع روشن کی جاتیں، علماء شعرا اور ادبا جمع ہوتے، بحثیں ہوتیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ مرد تو محفلوں میں بیٹھتے اور عورتیں پردے کے اوٹ میں بیٹھتیں اور ہمہ تن گوش ہوکر مشاعرہ سنتیں، اچھے اشعار پر داد دیتیں۔

تیموری بیگمات اور شہزادیوں میں بہت سی شخصیتیں ایسی گذری ہیں جو نہایت علم دوست، ادب پرور اور شاعرہ و ادیبہ تھیں۔ ان میں کئی تو صاحب دیوان شاعرہ بھی تھیں اور کئی اعلیٰ درجہ کی مؤرخہ۔ ان بیگمات اور شہزادیوں میں گلبدن بیگم، جانان بیگم، نور جہاں بیگم، ممتاز محل، جہان آرا بیگم، زیب النساء بیگم (مخفی)، زینت النساء بیگم اور حمیدہ بانو بیگم سر فہرست ہیں۔ یہ بیگمات اور شہزادیاں بذات خود بہت پڑھی لکھی، عالمہ، فاضلہ اور شاعرہ تھیں۔ وہ علمی مباحث میں شامل ہوتیں، شعر کہتیں اور علماء و فضلاء کی ہمت افزائی بھی کرتی تھیں۔ بیگمات اور شہزادیوں کی اس دلچسپی میں خود مغل بادشاہوں کی سرپرستی شامل تھی۔ وہ اپنی بیگمات اور شہزادیوں کی علمی سرگرمیوں میں دل کھول کر تعاون کرتے تھے۔

مغل شہزادوں، امراء اور بادشاہوں کے دوش بہ دوش درباری خواتین بھی فارسی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کی مہم میں حصہ لیتی تھیں اور اہل ادب، شعراء اور دانشوروں کی سرپرستی اور حمایت کرکے ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی اپنی ایک شناخت اور جگہ بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان خواتین نے اکثر اپنی ذاتی مدد سے مدارس اور کتب خانوں کی تعمیر کرا کر فارسی کی بہت سی کتابوں کی تالیف نیز ترجمہ کی سبیل ہموار کی۔ وہ شاہی خاندانوں کے روایتی اور تربیتی اصول کی پیروی کرتے ہوئے لشکری اور درباری اصول و ضوابط اور آداب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی تعلیم سے بھی آراستہ ہوتیں اور مروجہ علوم و فنون سے بھی مزین ہوتی تھیں۔ درباری ماحول جو اس وقت زیادہ تر فارسی زبان و ادب پر قائم تھا ان شہزادیوں کو اس سے اس قدر انسیت ہوگئی تھی کہ انھوں نے اپنے ذاتی علمی و ادبی نقوش کو نظم و نثر کی صورت میں یادگار چھوڑا۔

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کا ورود سلاطین غزنوی کے متواتر حملوں کے نتیجے میں ہوا۔ غزنوی حکومت کے انحطاط اور کمزوری کے بعد لاہور ہندوستان کا علمی و ادبی مرکز بن گیا۔ غوری اور سلاطین دہلی (عصر ممالیک، سلاطین خلجی، تغلق شاہی، سادات اور لودھی)

خاندان کے بادشاہوں کے وقت میں بھی فارسی زبان وادب کو سلاطین کی تایید حاصل رہی اور اس کا نشو و نما ہوتا رہا اور بہت پائے کے علماء، مورخ، شعرا اور ادبا منصّۂ ظہور تک پہنچے اور ان کے ذریعے کشف المحجوب، لباب الالباب، جوامع الحکایات و لوامع الروایات، تاج المآثر، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی، سیرت فیروز شاہی، فتوحات فیروز شاہی اور تاریخ مبارک شاہی جیسے علمی و ادبی شہ پارے عالم وجود میں آئے۔ اس کے علاوہ بہت سے شعرا بھی آسمان ادب میں چمکے جنھوں نے اپنا دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔ اس طرح اس دور میں فارسی زبان و ادب نے اپنے کمال اور ارتقاء کا ایک دور گذارا اور اس سلسلۃ الذہب کی لڑی مغل بادشاہوں کے دور میں مکمل ہوئی۔ یہ بات ناقابل فراموش ہے کہ مغلیہ دور میں فارسی زبان وادب مغل بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں اور امراء کی رہین منت ہے جو پورے خلوص کے ساتھ دانشوروں، علما اور ادبا کی سرپرستی اور حمایت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے تھے۔

تیموری بادشاہوں اور شہزادوں کے علمی و ادبی سرگرمیوں کے مقابل تیموری خاندان کی خواتین کا کردار بھی فارسی زبان وادب کی ترویج میں اہم رہا ہے۔ اس عہد میں دربار کی بیشتر خواتین تعلیم و تعلم سے وابستہ تھیں اور بہت سے شہزادوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بھی انھیں بیگمات اور شہزادیوں کے کندھوں پر عائد تھی۔ مغل شہنشاہ بھی خواتین کی تعلیم وتربیت کے تئیں نہایت سنجیدہ تھے جیسا کہ اکبر شاہ نے ایک ایسا مدرسہ قائم کیا جو خواتین کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا۔ آنہ ماری شیمل نے "ایشین رائل سوسائٹی" میں موجود ایک ایسی نقاشی کا ذکر کیا ہے جس میں مغل درباری خواتین اپنے پیرو مرشد سے لکھنا اور پڑھنا سیکھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ [۱]

دربار کی شہزادیوں اور خواتین کی تعلیم کے لیے ایک مخصوص جگہ کا انتخاب ہوتا تھا جو عام طور سے قصر سلطنتی کے عمومی مکانات سے الگ ہوتا اور ان کے لیے شائستہ اور مجرب اتالیق کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ ان کی کتابیں شاہی کتب خانوں سے فراہم ہوتی تھیں۔ نیز ان میں سے بیشتر خواتین کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی موجود تھے۔ [۲]

قرآن مجید اور اسلامی و مذہبی وظائف کی تعلیم ایک خاص اور متعینہ مدت تک سبھی شاہی

---

[۱] آنہ ماری شیمل، در قلمرو خانان مغل: ترجمہ فرامرز نجد سمیعی: ص ۱۹۹

[۲] Ruby Lal, *Domesticity and power in the early Moughal world,* p.104

دربار کے متعلقین کی زندگی کا جزو ہوا کرتا تھا۔ مگر جو تعلیم خصوصی اہتمام کے ساتھ دی جاتی تھی وہ فارسی زبان و ادب، بالخصوص فارسی کے عظیم المرتبت شعراء کے اشعار کی تعلیم تھی(۳)۔اس طرح مغل دربار کی بیشتر تعلیم یافتہ خواتین فارسی اشعار سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی شعر وشاعری کے ذوق سے مالامال ہوتی تھیں۔

شاعرہ اور سخنور خواتین: مغل خاندان کی خواتین کو فارسی زبان کے بزرگ شعراء کے کلام سے آشنائی کے بعد اس زبان سے ایک گہری الفت اور انسیت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ صفت سراج الدین علی خان آرزو، جو اپنے وقت کا بہترین محقق، ادیب، شاعر اور تذکرہ نویس (مجمع النفائس) تھا، کے دعوے کے خلاف ثابت ہوتی ہے جن کا کہنا تھا "عورتیں نہ ہی پیغمبری کے لائق ہیں اور نہ ہی ان کا معیار شعر وشاعری کی بلندیوں اور باریکیوں کو چھو سکتا ہے کیونکہ وہ اس دنیا میں صرف اس لئے آئی ہیں تاکہ کسی کی ماں یا خالہ بن سکیں!"(۴) ان میں سے بعض خواتین نے اپنے ذوق و ہنر کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں اور فکر انگیز اشعار بھی تخلیق کیے، اس کے علاوہ شاعروں کو داد و دہش دے کر علم و ادب کی محفلوں کو روشن رکھا تھا۔ اس زمانے کے مآخذ کی ورق گردانی سے اس بات کے لیے ثبوت دستیاب ہوتے ہیں کہ مغل دربار کی بہت سی خواتین دربار میں سیاسی اثر ورسوخ کے ساتھ ادب کے میدان میں بھی شہسوار تھیں جن میں سے کچھ کا ذکر ہم درج ذیل پیش کر رہے ہیں:

۱۔ گلبدن بیگم: ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھنے کا سہرا شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے سر ہے۔ اس کی طوفانی زندگی، کشمکشِ پیہم، جانکاہ مصائب والم، مسلسل حرکت و عمل اور جد و جہد سے عبارت تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد اس کی زندگی میں قدرے سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ بڑے سے بڑے سرکش اور جری سے جری انسان نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ کابل اس کا دارالخلافہ تھا۔ اسی دارالخلافہ کے نواح میں سنہ ۱۵۲۳ء میں اسے دلدار بیگم کے بطن سے ایک نئی بچی کی ولادت کا مژدہ ملا۔ بچی کیا تھی، ایک نورس گل نو دمیدہ کی طرح حسین و نازک تھی جس کا نام گلبدن بیگم رکھا گیا۔ گلبدن بیگم کی پرورش، پرداخت اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری

(۳) آنہ ماری شیمل، در قلمرو خانان مغل ص ۱۹۹

(۴) آرزو بہ نقل از سعید شفیعیون: ص ۱۸۴

بابر کی محبوب بیوی ماہم بیگم نے اپنے ذمہ لی۔

بچپن کے جذبات و احساسات اور طفلانہ شوخی اور شرارت کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کی آمیزش نے اس کے کردار میں عجیب سا حسن پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس قدر طباع اور ذہین تھی کہ بچپن سے ہی اسے حال کے واقعات کے آئینہ میں مستقبل کے حالات کا عکس نظر آجاتا تھا اور آغاز میں ہی انجام کے چہرے سے وقت اور فاصلے کے حجابات اٹھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ تیموری اور چنگیزی خاندان کے خون کے اشتراک و امتزاج کا ایک حسین مرقع تھی۔ شہزادیوں کی طرح اس کی تعلیم ہوئی۔ انتہائی ذہین، ذکی الحس اور رقیق القلب تھی۔ علمیت کے لحاظ سے اسے اپنے دور کی خواتین پر فوقیت حاصل تھی۔ گلبدن بیگم اپنی اعلی تعلیم و تربیت کی بدولت ترکی اور فارسی زبان کے قابل قدر انشا پردازوں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ ایک عظیم شاعرہ بھی تھی۔ فارسی زبان میں اس کی ایک مستقل تصنیف "ہمایوں نامہ" ہے جو اپنے طرز انشا کے لیے بے مثل کتاب ہے اور بابر و ہمایوں کے عہد کی تاریخی، معاشرتی اور تمدنی حالات و واقعات کے لیے ایک بیش بہا قیمتی ماخذ ہے۔ یہ کتاب در اصل اکبر بادشاہ کے حکم سے گلبدن نے لکھی تھی۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث یہ ایک اہم تالیف ہو گئی۔ انگلستان کی ایک علم دوست خاتون نے اس کو بڑی محنت اور کاوش سے ایڈٹ کر کے ۱۹۰۲ء میں لندن سے شائع کیا۔

"ریاض الشعرا اور مخزن الغرائب" میں گلبدن بیگم کا نام بھی شعرا کی فہرست میں درج ہے، لیکن افسوس کہ دونوں تذکروں میں اس کا صرف مندرجہ ذیل ایک شعر مذکور ہے اور مسز بیورج نے اسی شعر کو ہمایون نامہ کے دیباچہ میں میر مہدی شیرازی کے "تذکرۃ الخواتین" سے نقل کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

ہر پری روئی کہ او با عاشق خود یار نیست تو یقین دارش کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست [(۵)]

(ہر وہ محبوب جو اپنے عاشق سے دور ہے، یقین جان لو کہ اسے زندگی کا کوئی لطف حاصل نہیں ہے)

اکبر نامہ (جلد سوم صفحہ ۸۱۷) میں درج ہے کہ گلبدن بیگم کے عالم نزع میں مریم مکانی اس

[(۵)] احمد علی خان ہاشمی سندیلوی، تذکرہ مخزن الغرائب، ج ۵، ص ۱۲۴۰؛ مہری شاہ حسینی؛ زنان پارسی گوی ہفت شہر عشق، ص ۸۵۹

کے سرہانے کھڑی تھیں۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ مریم گلبدن کو محبت سے "بیگم جیو" کہہ کر پکار رہی تھی۔ گلبدن بیگم نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور مریم کی طرف دیکھ کر یہ مصرع پڑھا:

من زار بمر دم عمرت باد ارزانی

(میں تو اپنے تمام درد و رنج کے ساتھ قضا کی طرف چل پڑی، مگر تمہاری عمر دراز ہو!)

۲۔ گلرخ بیگم: گلرخ بیگم اورنگ زیب جیسے عدیم المثال باپ کی عدیم المثال بیٹی تھی جو صالحہ سلطانہ بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ شاعروں اور ادیبوں کا اس کی نگاہ میں بہت احترام تھا۔ وہ خود بھی شعر و شاعری سے شغف رکھتی تھی۔ تذکرہ اور تاریخوں کے مطالعہ سے اس کے شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ "صبح گلشن" مؤلفہ نواب علی حسن خان میں اس کی شاعری کا ذکر درج ذیل الفاظ میں مرقوم کیا گیا ہے: "بہ گلرخی و شگفتہ روی و سلیقۂ شاعری سر آمد زمرۂ نسوان، غنچۂ دہانش بہ نسیم اشعار لطیف شگفت۔" (گلرخی، شگفتہ روئی اور شاعری کے اسلوب اور حسن میں صنف نسواں سر خیل ہے اور اس کے غنچہ جیسا منھ، اشعار کی نسیم سے کِھل اٹھتا ہے!) مذکورہ تذکرہ کے علاوہ، "ریاض الشعرا" اور "مخزن الغرائب" کے مؤلفین نے بھی گلرخ بیگم کا ذکر شاعرہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ ریاض الشعرا، مخزن الغرائب اور تذکرۂ صبح گلشن کے مؤلفین نے گلرخ بیگم کی جانب درج ذیل شعر منسوب کیا ہے۔ یہ شعر وزن، ردیف اور قافیہ کے اعتبار سے گلبدن بیگم کے شعر سے حد درجہ مشابہت رکھتا ہے:

ہیچ گہ آن شوخ گل رخسار بی اغیار نیست راست بودہ ست آن کہ در عالم گل بی خار نیست [۶]

(افسوس ہے کہ میرا خوبصورت محبوب کبھی بھی اغیار کی نگاہ اور بندشوں سے آزاد نہیں، یہ بات صحیح ہے کہ اس دنیا میں کوئی پھول بغیر خار کا نہیں ہوتا!)

۳۔ سلیمہ سلطان بیگم: تیموری شہزادیوں میں ایک نام سلیمہ سلطان بیگم کا بھی آتا ہے۔ یہ بابر کی نواسی اور گلرخ بیگم کی بیٹی تھی۔ جہانگیر سلیمہ سلطان کی علمی صلاحیت کا معترف تھا۔ سلیمہ سلطان بیگم نہایت پاک طینت، شیریں گفتار، بذلہ سنج، سلیقہ شعار اور صائب الرائے خاتون تھی۔ بلا کی سخن فہم اور سخن سنج تھی۔ ارباب علم و فن کی قدر افزائی کرتی، حرم شاہی میں اس کا بڑا احترام تھا۔ جہانگیر کو سلیمہ سے بے حد محبت تھی۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے: "بہ جمیع صفات حسنہ

---

[۶] ماگہ رحمانی، پردہ نشینان سخن گو: باز نویسی فاطمہ صادقی، ص ۴۷

آراستگی داشتند، در زنان این مقدار ہنر و قابلیت کم جمع می شود۔"(۷) ([سلیمہ سلطان بیگم] تمام تر صفات حمیدہ اورحسنہ کی حامل تھی، عورتوں کے اس منزلِ کمال اور ہنر و قابلیت پر فائز ہونے کی نظیر کم ہے!)

سلیمہ بڑی صاف دل، پاکیزہ مزاج، حیاپرور اور عفت مآب خاتون تھی۔ شعر بھی کہتی تھی۔ آئین اکبری، اقبال نامہ جہانگیری اور مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۲۷۶ پر درج ہے کہ وہ "مخفی" تخلص کرتی تھی، اس کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

کاکلت را گر ز مستی رشتہ جان گفتہ ام　　　مست بودم، زین سبب حرف پریشان گفتہ ام

(اے محبوب! اگر میں نے سکر اور بے خودی کے عالم میں تمہاری زلفوں کو اپنے لئے رشتہ جان کہہ دیا تو مجھے معاف کرنا، میں تو مست و کیف کے عالم میں تھا اس لیے انجانے میں یہ کہہ بیٹھا!)

۴۔ جانان بیگم: بیرم خان ترکمانوں کے قبیلے قراقویونلو سے تعلق رکھتا تھا۔ جب اس کی عمر ۱۶ سال ہوئی تو وہ ہمایوں کے ساتھ ہو گیا اور اس کا دست راست بن گیا۔ جانان بیگم اسی لائق وفائق آدمی کی بیٹی تھی۔ عبد الرحیم خان خانان اس کا بھائی تھا۔ جانان بیگم کی شادی شہنشاہ اکبر کے بیٹے شہزادہ دانیال سے ہوئی تھی۔ جانان بیگم نہایت حسین و جمیل، عاقلہ اور بالغہ و تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ قرآن مجید کی تفسیر کے علاوہ کچھ اشعار بھی اس نے یادگار چھوڑے ہیں جو بطور نمونہ مندرجہ ذیل ہیں:

ز راہ امن و سلامتی کسی بہ او نرسد　　　غبار تا نشود خاک پا بہ او نرسد
عاشق ز خلق، عشق تو پنہان چہ سان کند؟　　　پیدا ست از دو چشم ترش خون گریستن(۸)

(عشق کے راستے میں امن و سلامتی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ جب تک عاشق غبارِ کوئے یار نہیں ہوتا محبوب کی قدم بوسی نصیب نہیں ہوتی۔ اے محبوب! تمہارا عشق سر چڑھ کر بول رہا ہے، تم خود ہی بتاؤ اس راز کو کس طرح لوگوں سے چھپایا جائے؟ کیونکہ عاشق کی خوں بار آنکھیں شدت فراق میں ہر راز کو فاش کر رہی ہیں)

۵۔ کاملہ بیگم: اکبر کی چوتھی بیوی جو ایک فارسی گو شاعرہ تھی۔ اس کا تعلق ایک راجپوت خاندان

---

(۷) نور الدین محمد سلیم جہانگیر، تزک جہانگیری، مطبع نولکشور، ص ۱۱۴

(۸) علی اکبر مشیر سلیمی؛ زنان سخنور: ص ۱۵۰

سے تھا جس کے شعری ذوق کا اعلی اور بہترین نمونہ اکبر بادشاہ کے دربار کے ملک الشعرا اور ابوالفضل کے بھائی شیخ فیضی فیاضی کے انتقال پر مرثیہ ہے:

فیضی مخور این غم کہ دلت تنگی کرد   با پای امید عمر لنگی کرد
می خواست کہ مرغ روح بیند رخ دوست   زین واسطہ از قفس شب آھنگی کرد[۹]

(فیضی تم اپنے دل سے مجبور ہو کر غم نہ کھاؤ اگرچہ تمہاری امیدوں اور آرزوؤں کے پیر بھی شل ہو چکے ہوں۔ دل تو اتنا بے چین ہے کہ جب مرغِ روح نے رخِ یار کے دید کی تمنا کی، تو جاں بر کف ہو کر قفس عنصری سے پرواز کر کے محبوب کا دیدار کرنا چاہا!)

۶۔نور جہاں بیگم: ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا سہرا اگر کسی خاتون کو زیب دیتا ہے تو وہ جہانگیر کی ایرانی بیوی ملکہ نور جہاں ہے۔ تیموری خاندان کی خواتین میں نور جہاں سوجھ بوجھ میں سب سے پیش پیش اور مقتدر نظر آتی ہیں۔ نور جہاں کو جہانگیر سے شادی کے بعد "نور محل" اور بعد میں "نور جہاں" کے لقب سے نوازا گیا۔ اس کا شاہی دربار میں اس قدر اثر و رسوخ تھا کہ شاہی خطوط اور فرامین کو وہ بہ نفس نفیس مہر لگاتی تھی اور اس کے نام ایک سکہ بھی ضرب ہوا جس پر نور جہاں اور جہانگیر دونوں کے نام منقش ہیں۔[۱۰]

نور جہاں بیگم کے بیشتر اشعار میں اس کی کیف درونی، خوشحالی و مسرت کا انعکاس نظر آتا ہے، ملاحظہ ہو:

دل بہ صورت ندھم ناشدہ سیرت معلوم   بندہ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم

(اے زمانہ جان لے کہ میرا عشق کوئی سطحی عشق نہیں، کیونکہ سیرت جانے بغیر میں صرف صورت پر دل نہیں ہارتا، میں بندۂ عشق و محبت ہوں مجھے بہتّر فرقوں سے کوئی واسطہ نہیں! یعنی میرے نزدیک صرف ایک ہی مذہب ہے جو عشق کا مذہب ہے)

---

[۹] علی اکبر مشیر سلیمی؛ زنان سخنور: ص ۱۰۵۔ مخزن الغرائب ورق ۳۶۰ میں فیضی کے مرثیہ پر یہ رباعی درج ہے جو ایک خاتون کاملہ بیگم کے ذکر میں نقل کی گئی ہے۔ مگر تذکرہ نگار نے رباعی لکھنے سے پہلے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بعض نسخوں میں یہ رباعی سلیمہ سلطان بیگم کی طرف بھی منسوب ہے۔

[۱۰] Rekha, Misra, *Women in Moghal India,* pp. 149-150

زاہد ہول قیامت مفگن در دل ما ہول ہجراں گذراندیم و قیامت معلوم(۱۱)

(اے زاہد پاک سرشت! تو ہمارے دل میں بے سبب خوفِ قیامت ڈال رہا ہے، ہم جیسے نامراد عاشق ہجر و جدائی کا طوفان سہہ چکے ہیں، اب اس سے بڑی قیامت ہمارے لیے اور کیا ہوگی!)

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار است کلید قفل دل ما تبسم یار است

(صحرا میں اگر غنچہ کا تبسم نسیم بہاری پر منحصر ہے تو اے دنیا والو جان لو! ہمارے دل کے کھلنے اور خوش ہونے کا راز بھی محبوب کی مسکراہٹ میں ہے)

نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو، نہ عارض و زلف دل کسی کہ بہ حسن و ادا گرفتار است(۱۲)

(عاشق کو عشق بازی کے لیے رنگ، خوشبو، رخ اور زلف جیسے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی، سچا عاشق تو وہی ہے جس کی نظر میں حسن سمایا ہو اور جو محبوب کی اداؤں میں فنا ہو گیا ہو)

ای آبشار نوحہ گر از بھر چیستی؟ چیں بر جبین فگندہ ز اندوہ کیستی؟

(اے نوحہ گر اور بہتے ہوئے جھرنو! تمہاری بے قراری اور آنسوؤں کا سبب کیا ہے؟ تمہاری جبین پر غم اور اندوہ کی شدت سے کس کی جدائی کی لکیریں پڑی ہوئی ہیں)

دردت چہ بود کہ چون من تمام شب سر را بہ سنگ می زدی و می گریستی؟(۱۳)

(ایسا کون سا راز سربستہ اور داغ، دل میں چھپائے بیٹھے ہو جس کی بے چینی کے سبب میری طرح تمام رات فراق میں مبتلا ہو کر اپنا سر پتھر سے ٹکرا رہے ہو؟)

ایک روز جہانگیر نے لباس تبدیل کیا جس کا تکمہ (بٹن) لعل بے بہا تھا۔ نور جہاں نے اس کو دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا:

تُرا نہ تُکمۂ لعل است بر قبای حریر شدہ است قطرۂ خون منت دامن گیر(۱۴)

([اے بادشاہ] تمہارے ریشمی کپڑے پر یہ سرخ بٹن جو دیکھنے میں لعل بے بہا لگتا ہے دراصل میرے جگر کا خون ہے جو تمہارے دامن کو تھامے بیٹھا ہے، یعنی میرے عشق کے خون سے

---

(۱۱) صمام الدولہ شاہنواز خان؛ مآثر الامرا، ج ۱، ص ۱۳۴

(۱۲) محمد حسن رجبی؛ مشاہیر زنان ایرانی و پارسی گوی از آغاز تا مشروطہ: ص ۲۳۹

(۱۳) ماگہ رحمانی؛ پردہ نشینان سخن گو: ص ۸۱

(۱۴) احمد گلچین معانی، کاروان ہند: ج ۲، ص ۱۴۶۵

تمہارا دامن داغدار ہے)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جہانگیر نے ہلال عید دیکھنے کے بعد نور جہاں سے کہا:

ہلال عید بر اوج فلک ھوید اشد

(عید کا چاند آسمان میں نمودار ہو گیا)

نور جہاں نے فوراً دوسرا مصرع پڑھا:

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

(یہ چاند نہیں بلکہ میکدہ کی کنجی ہے جو نظروں سے غائب ہو جانے کے بعد رویت ہلال کے ساتھ مل گئی اور لوگوں پر خوشی طاری ہو گئی ہے)

نور جہاں نے شہنشاہ جہانگیر کے انتقال کے ۱۸ سال بعد دسمبر ۱۶۴۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس ملکہ کو اس کے تعمیر کردہ مقبرہ واقع شاہدرہ لاہور متصل ریلوے لائن دفن کیا گیا جو جہانگیر کے مزار کے پاس واقع ہے۔ اس کی لوح مزار پر آج بھی یہ شعر نظر آتا ہے:

بر مزار ما غریبان نی چراغی نی گلی نی پر پروانہ سوزد نی صدای بلبلی

(ہم جیسے غریب اور گمنام لوگوں کے مزار پر نہ ہی کوئی چراغ ہوتا ہے نہ ہی کوئی پھول، نہ ہی کوئی پروانہ ہمارے شمع وجود کا خواہاں ہے اور نہ ہی کسی بلبل کے چہچہانے کی آواز ہمارے دل کی تسلی کا باعث ہوتی ہے!)

نور جہاں علاوہ ازیں کہ خود ایک بہترین شاعرہ تھی، علم و ادب کی سرپرستی میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے طالبی، ساعد گیلانی، اصفہانی، نقیب خان، نعمت اللہ خان و عبد الحق دہلوی جیسے آسمان ادب کے ستاروں کی مادّی اور معنوی حمایت اور سرپرستی کی۔ مندرجہ ذیل قصیدہ جہانگیر کے درباری ملک الشعراطالب آملی کا ہے جو نور جہاں کی مدح و وصف میں قلمبند کیا گیا ہے:

این چہ عماری ست، وین چہ قبۂ پر نور ساکن این مہد کیست دیدۂ بد دور؟

(یہ کیسی خوبصورت اور مبارک عمارت ہے جس سے زمین تا بہ آسمان نور ہی نور ہے؟ اس مکان کا مکین کون ہے؟ اللہ اسے نظر بد سے دور رکھے)

مہد، حرم گاہ پادشاہ جہان ست مہد نشین، شمع خانوادۂ دستور

(کون سا آشیانہ، وہ جگہ جو دنیا کے بادشاہ کا حرم و محل ہے، اور مسند نشین کون؟ وہ جو خاندان

ریاست و قیادت کی شمع ہے)۔

نور محل بیگم آن کہ پیش رکابش فخر کنان می روند قیصر و فغفور

(نور محل بیگم جن کی عظمتوں کا یہ عالم ہے کہ قیصر و کسری اور چین کے بادشاہ بھی اس کے حاضر باشِ رکاب ہیں اور اس خدمت پر نازاں ہیں)

نیست فلک را بہ پاکدامنی او در پسِ نُہ پردہ یک ستارۂ مستور

(چشم فلک نے ان کے جیسی باعفت و باحیا خاتون نہیں دیکھی، یہاں تک کہ نو آسمانوں کے پردوں میں مستور بھی کوئی ان کے جیسا نہیں)

۷۔ ارجمند بیگم: شاہ جہاں کی بیوی اور نور جہاں کے بھائی آصف خان کی چہیتی بیٹی تھی۔ وہ تیموری دربار کی ایک ادب دوست اور ہنر مند خاتون تھی جسے مؤرخوں نے "ممتاز جہاں" "ممتاز محل" اور "مہد علیا" کے نام سے یاد کیا ہے۔[(۱۵)]

شاہ جہاں ایک باذوق حکمراں تھا۔ اسی باذوق اور جمالیاتی حس سے آراستہ و پیراستہ شہنشاہ کی ممتاز محل بھی تھی۔ وہ علوم متداولہ کے ساتھ زیور علم و فضل سے بھی آراستہ تھی۔ ممتاز محل نہ فقط سخن فہم بلکہ سخن سنج بھی تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار شاہ جہاں جمنا ندی کے کنارے بیٹھ کر دریا کے گوناگوں مناظر میں محو تھا، اچانک اس کی موجوں کی طرف اشارہ کر کے اس نے ممتاز محل سے کہا:

آب از برای دیدنت می آید فرسنگ ہا

(پانی تمہارے دیدار کے لیے کوسوں دور سے آتا ہے)

ممتاز محل نے فی البدیہہ جواب میں یہ مصرع موزوں کیا:

از ہیبت شاہ جہاں سر می زند بر سنگ ہا

(شاہجہاں کی ہیبت و عظمت کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہو جاتا ہے اسی لیے فرط شرمندگی سے اپنا سر پتھر پر مارتا ہے)

یہ روایت جو صرف اردو کی کچھ کتابوں میں منقول ہے لیکن فارسی کتب، تذکروں اور

---

(۱۵) ملا عبد الحمید لاہوری؛ پادشاہ نامہ: ج ۱، ص ۹۳

تاریخوں میں اس کی روایت دیکھنے کو نہیں ملی۔ اس کے علاوہ داراشکوہ اور جہاں آرا جیسے صاحب فراست اور عالم اولاد کی تربیت کر کے اپنے لیے باقیات صالحات یادگار چھوڑا ہے۔

۸۔ اعزاز النساء بیگم: شاہ جہاں کی دوسری بیوی، فارسی زبان و ادب کی دلدادہ تھی۔ تیموری خاندان کی اس فاضل خاتون نے شاہ جہان آباد (دہلی) کے فیض بازار میں اکبر آبادی نامی مسجد تعمیر کروائی تھی جس کے تمام کتبے فارسی رسم الخط اور زبان میں لکھے گئے اور کچھ موقوفات بھی اس پر عطیہ کیا۔ افسوس کہ سنہ ۱۲۷۳ھ میں برطانوی سامراج کے دور میں اس مسجد کو شہید کر دیا گیا۔

۹۔ جہاں آرا بیگم: جہاں آرا شاہ جہاں اور ممتاز محل کی بیٹی تھی۔ ممتاز محل کی گود، نور جہاں کی صحبت اور شاہ جہانی عہد کی اعلی علمی فضا میں پرورش پا کر وہ علم و فضل کے لحاظ سے بڑی مشہور ہوئی۔۔ وہ شہنشاہ ہندوستان کی لاڈلی بیٹی اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی کی بہن تھی۔ تاریخ میں اس قسم کے واقعات موجود ہیں کہ جب جہاں آرا کے بھائیوں کو کوئی بہت اہم معاملہ درپیش ہوتا تو وہ اپنی بہن سے مشورہ کرتے تھے۔ جہاں آرا کو یوں تو اپنے سب ہی بھائیوں سے محبت تھی لیکن وہ داراشکوہ پر زیادہ مہربان تھی چونکہ یہ دونوں بھائی بہن تصوف کے دلدادہ اور اولیائے کرام کے عقیدت مند تھے۔ داراشکوہ اپنی تالیف "سکینۃ الاولیا" میں جو، سلسلۂ قادریہ کے مشائخ سے تعلق رکھتی ہے، اپنی بہن جہاں آرا کو "رابعۂ عصر"، "فاطمۂ دہر"، "مریم وقت"، "عابدۂ عارفہ اور کاملۂ واصلہ" جیسے صفات سے یاد کرتا ہے۔[۱۶] اسے اپنے صوفیائے وقت سے بھی بہت زیادہ عقیدت تھی خاص کر سلطان الہند غریب نواز حضرت سید معین الدین چشتی سنجری اجمیری اور ان کے سلسلے کے بڑے اکابر خلفاء مثلاً شیخ حمید الدین ناگوری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی وغیرہ۔ ان بزرگوں کے احوال اس نے بہت ہی عقیدت سے لکھے ہیں جس سے اس کے مذہبی اور صوفیانہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کا نام "مونس الارواح" ہے۔ اس کی تالیف میں اس نے بڑی احتیاط کی ہے۔ ایک جگہ رقم طراز ہے: "احوال این بزرگان را کہ مقربان درگاہ...... اندازۂ کتب و رسائل معتبرہ بہ احتیاط تمام بیرون آوردہ بہ قید تحریر آوردہ شد و اعتقاد این ضعیفہ آن چہ درین رسالہ ثبت گردیدہ صحت تمام دارد، امید کہ خوانندگان را فیض و بہرۂ تمام ازان حاصل

---

(۱۶) محمد داراشکوہ؛ اوپانیشاد (سر اکبر): ج۱، ص۱۵۵

آید۔" (ان بزرگان و مقربان الٰہی کے احوال کو معتبر دستاویزوں سے بڑی احتیاط و باریک بینی سے جمع آوری کی ہے اور اس ناچیز (راقم الحروف) کا دعویٰ ہے کہ اپنی دانست میں تمام ثبت شدہ باتیں صحیح و ثقہ ہیں، امید ہے کہ قارئین کے لیے سرچشمۂ فیضان ہو گا)۔ ایک سوانح نگار نے ان کی تالیفات میں رسالۂ صاحبیہ، ایک سیاحت نامہ اور ایک مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱۷]

جہان آرا نے سب سے زیادہ اپنی ماں کی خاص سہیلی ستی النساء ملک الشعراء طالب آملی کی بہن سے تعلیم حاصل کی اور اسی معلمہ کے ہاتھوں قرآن اور فارسی زبان و ادب سے آشنائی حاصل کی۔ جہاں آرا کا شغف عرفان و تصوف، اخلاق، سیرت، تاریخ، ادب اور انشاء کی کتابوں کا زیر مطالعہ رکھنا تھا۔ نظم و نثر، خوش نویسی اور مکتوب نگاری میں اسے ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔[۱۸]

سنہ ۱۰۹۲ء میں انتقال کے بعد جہاں آرا کو خواجہ نظام الدین اولیا کے صحن میں دفن کیا گیا اور اس کا خود اپنا شعر اس کے لوح مزار کا زینت قرار پایا:

به غیر سبزه نپوشد کسی مزار مرا   که قبرپوش غریبان همین گیاه بس است[۱۹]

(گھاس کے علاوہ ہماری قبر پوشی کے لیے اور کچھ دستیاب نہ ہو گا، ہم غریبوں کی مزار کے لیے یہی چادر کافی ہے!)

مندرجہ ذیل مرثیہ جہاں آرا نے شاہ جہاں کے فراق میں قلمبند کیا ہے:

ای آفتاب من که شدی غائب از نظر   آیا شب فراق تو را کی بُود سحر
ای پادشاه عالم و ای قبلهٔ جهان   بگشای چشم رحمت و بر حال من نگر
نالم چو نی ز غصه و با دم بود به دست   سوزم چو شمع در غم و دودم رود ز سر

(اے میرے سورج جیسے محبوب، جو نظروں سے غائب ہو کر غروب کر گئے، کیا کبھی وہ لمحہ بھی آئے گا جو اس شبِ فراق کو وصل کی سحر سے ملا دے!

اے عالم کے بادشاہ، اے قبلۂ عالم، اپنی آنکھیں کھولو اور میری حالتِ زار پر اپنی نظر کرم کر دو میں بانسری کی طرح اپنے دکھ درد کو بیان کر رہی ہوں اور میری مغموم اور نحیف آواز اس بات پر

---

[۱۷] جہان آرا بیگم، مونس الارواح، مقدمہ و حواشی ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی: ص ۴۵
[۱۸] نجفی برزگر؛ فصلنامہ مطالعات شبہ قارہ دانشگاہ سیستان و بلوچستان: ص ۱۲۵
[۱۹] علی اکبر مشیر سلیمی؛ زنان سخنور: ص ۱۵۳

دلیل ہے کہ میں شمع کی طرح تمہاری جدائی میں جل رہی ہوں اور اس کا دھواں میرے سر سے نکل رہا ہے)

۱۰۔ زیب النساء بیگم: تیموری شہزادیوں کے علمی چمنستان کی گل سرسبد زیب النساء اورنگ زیب کی چہیتی بیٹی تھی۔ اس کی والدہ کا نام دلرس بانو بیگم تھا جو شاہنواز خان صفوی کی بیٹی تھی۔ عالمگیری امرا میں عنایت اللہ خان نہایت معزز عہدہ دار تھا، اس کی ماں حافظہ مریم نہایت ہی ذہین، قابل اعتماد اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ جب زیب النساء پڑھنے کے قابل ہوئی تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لئے حافظہ مریم کو مقرر کیا۔ زیب النساء نے دو سال چار ماہ کی مدت میں حافظہ مریم کی شاگردی میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔

تیرہ سال کی عمر میں زیب النساء شاہی آداب و قوانین کے ساتھ ساتھ وقار شاہانہ اور مغلیہ تاریخ سے بخوبی واقف ہو گئی۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اس کو مستحکم بنیاد پر دی گئی۔ تمام تاریخیں اور تذکرے متفق الرائے ہیں کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی۔ اورنگ زیب کی طرف سے یوں تو شہزادی کے لیے کئی استاد رکھے گئے تھے لیکن ان اساتذہ میں سب سے زیادہ مقرب اور باریاب ملا محمد سعید اشرف مازندرانی تھے جو علامہ محمد تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ ملا اشرف تقریباً چودہ برس تک شہزادی موصوفہ کی تعلیم کے سلسلے میں مصروف رہے اور ہر فن پر عبور حاصل کرنے کے بعد شاعرانہ ذوق بھی پیدا کیا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ شہزادی زیب النساء کو فن شاعری کے بنیادی اصول اور اعلیٰ منازل پر دسترس حاصل تھی اور حمد و نعت لکھنے کا شوق تھا۔ تصوف اور اخلاقیات پر بھی زیب النساء کے اشعار ملتے ہیں، البتہ "مخزن الغرائب" کے مؤلف نے اس کی صرف ایک کتاب "زیب المنشآت" کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے: "زیب المنشآت کہ از تالیف آں جناب است، فقیر آن را زیارت نمودہ"[۲۰] یہ کتاب زیب النساء کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔ زیب النساء اشعار میں "زیب" اور "مخفی" تخلص کرتی تھی:

در سخن مخفی شدم چوں بوی گل در برگ گل ہر کہ خواہد دیدنم گو در سخن بیند مرا

(جس طرح پھول کی خوشبو اس کے پنکھڑیوں میں ہوتی ہے، بالکل اسی طرح میں بھی اشعار میں

---

[۲۰] شیخ احمد علی خان ہاشمی سندیلوی؛ مخزن الغرائب: ج۵، ص۸

چھپ گئی ہوں، جس کو بھی مجھے دیکھنا ہے کہہ دو اشعار کی صورت میں میری صورت کی تلاش کرے!)

اس کے پندرہ ہزار سے زائد اشعار میں مذہبی عقائد، وطن دوستی اور صوفیانہ عواطف موجزن ہیں۔ زیب النساء ابتدا میں عربی گوئی کی طرف مائل تھی اور اپنے استاد شاہ رستم سے اصلاح شعر لیتی تھی مگر بعد میں اس مہم کے لیے نصیر الدین علی سرہندی اور محمد سعید اشرف مازندرانی کو منتخب کیا گیا۔[۲۱]

اپنے اسلاف کی پیروی کرتے ہوئے زیب النساء نے بھی شعراء وادباء کی خوب سرپرستی کی۔ محمد صفی قزوینی کو صرف اس لیے ایک ہزار روپیہ انعام اور سفر حج کا خرچہ دیا کیونکہ انھوں نے اس کی فرمائش پر قرآن کی تفسیر "زیب التفاسیر" تصنیف کی۔ قزوینی نے سفر حج سے واپسی کے بعد سوغات کے بطور "انیس الحجاج" نامی کتاب شہزادی کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے علاوہ محمد سعید اشرف نے بھی اس کی خواہش پر ایک مثنوی اور دیوان لکھ کر شاہزادی کی بارگاہ میں پیش کیا۔[۲۲]

۱۱۔زینت النساء بیگم: خاندان تیموریہ کے ممبران میں کوئی نہ کوئی خاص جوہر، خاص خوبی اور خاص ذوق تھا، خواہ وہ علمی وادبی ہو، سیاسی یا معاشرتی ہو یا دیگر فنون پر مشتمل مثلاً مصوری وغیرہ۔ اورنگ زیب کی دوسری لڑکیاں گو کہ زیب النساء کی علمی شہرت اور فضیلت کے سامنے ماند پڑ گئیں تھیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی مختلف قسم کے علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ تھیں۔ مآثر عالمگیری کا مؤلف لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی لڑکیوں میں زینت النساء بیگم نے بھی باپ کی توجہ اور فیض تربیت سے علم وادب کے میدان میں اپنے کمالات کے جوہر دکھائے۔[۲۳] ایک دوسرے تذکرہ "صبح گلشن" میں زینت النساء بیگم کا ذکر ایک کامیاب شاعرہ کی حیثیت سے دیکھنے کو ملتا ہے: " زینت النساء بیگم، ہمشیرۂ زیب النساء بیگم از بنات اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ است، عالمہ و شاعرہ و حافظہ کلام اللہ بود۔ زینت المساجد بنا کردہ اش، الی الآن در شہر

---

[۲۱] خواجہ عبد الرشید؛ تذکرہ شعراء پنجاب: ص ۱۶۸

[۲۲] آنہ ماری شیمل؛ در قلمرو خانان مغول: ص ۱۹۰

[۲۳] محمد ساقی مستعد خان؛ مآثر عالمگیری: ص ۳۹۵

شاہ جہان آباد موجود و معمور و بر سنگ مزارش کہ در صحن ہمان مسجد است این شعر خودش منقوش و منقول۔ ’’(زینت النسابیگم، زیب النساکی بہن اور اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی، عالمہ، شاعرہ اور قرآن مجید کی حافظہ بھی تھی۔اس کی تعمیر کی ہوئی مسجد زینت المساجد آج بھی شاہ جہان آباد (دہلی) میں موجود ہے اور اسی مسجد کے صحن میں اس کی قبر بھی موجود ہے جس پر خود اس کا اپنا کہا گیا شعر کندہ ہے):

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است سایہ ای از ابر رحمت قبر پوش ما بس است (۲۴)

(قبر کے اندھیروں میں ہمارا ہمدم اور مونس اللہ کا فضل اور کرم ہی کافی ہے، اس کی رحمتوں کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی ہمارے قبر پر سایہ فگنی کے لیے کافی ہے)

۱۲۔ زبدۃ النساء بیگم: مغلیہ دربار اور آسمان ادب کا ایک اور درخشندہ ستارہ اورنگ زیب کی دوسری دختر زبدۃ النساء بیگم ہے۔ مشیر سلیمی نے اپنی کتاب ’’زنان سخنور‘‘ میں اس شہزادی کا نام ’’زبیدہ‘‘ لکھا ہے اور اس کے نام کے ذیل میں یہ تکمیلی معلومات فراہم کی ہیں: ’’ اورنگ زیب کی بیٹی زبیدہ ایک موزوں طبع خاتون تھی۔ کبھی کبھی اشعار بھی بحر معانی سے موزوں کرتی تھی‘‘۔ مندرجہ ذیل ابیات اس کے طبع والا کی نشاندہی کرتے ہیں:

بادہ خوش شود گرخون عاشقان نوشی بعد ازین کی با او می توان زدن جوشی
ھر کجا بہ من برخورد، من ز عمر برخوردم رشک من نو طفلی پای تا سر آغوشی
ھر کجایی، اخلاقی، لاابالی آئینی پند ناصحان مشنو حرف کس مکن گوشی
دیر و زود خاطرھا، ھیچ کس ز مہ رویان مثل او ندارد یاد، زود کن فراموشی (۲۵)

(اے محبوب! بادہ اور جام تبھی لطف اندوز ہو سکتا ہے جب ہم بھی تمہاری طرح عاشقوں کا خون پینا شروع کر دیں، اس کے بعد ہی تیری برابری اور وصل کے لائق ہو سکتے ہیں۔
جب جب میرا محبوب مجھ سے ملا، مجھے ایسا لگا کہ اب میں بھی زندگی سے مل کر جینا سیکھ گئی، یہی تو زندگی بھر کی میری تمنا تھی
جہاں کہیں بھی رہو اخلاقیات یا بے اصولی کے ساتھ زندگی جینا تمہارے اختیار میں ہے، ناصح کی

---

(۲۴) صبح گلشن؛ سید علی حسن خان: ص ۱۹۱-۱۹۲

(۲۵) علی اکبر مشیر سلیمی؛ زنان سخنور، ص ۲۱۸؛ مہری شاہ حسینی؛ زنان پارسی گوی ہفت شہر عشق: ص ۸۴۲-۸۴۳

باتوں کو نظر انداز کرو اور کسی کا مشورہ مت سنو!

میرے محبوب جیسا کوئی بھی چاند جیسے چہرے والا نہیں ہے، نئی یا پرانی یادوں کو جلد بھول جاؤ

۱۳۔ قدسیہ بیگم: تیموریہ سلسلے کی دیگر باکمال خاتون، جو فارسی میں دسترس رکھتی تھی، محمد شاہ کی شریک حیات تھی۔ قدسیہ بیگم نے بھی بہت سے عام المنفعہ تعمیرات جیسے باغ اور مسجد انجام دیے۔ اشعار میں ''رعنائی'' تخلص کرتی تھی۔

کتب خانوں کی تعمیر اور قلمی نسخوں کی نقل: تیموری خاندان کی خواتین کی خدمات فارسی زبان و ادب کے تئیں صرف شعرا اور ادبا کی سرپرستی اور حمایت نیز شعر گوئی تک محدود نہ تھیں بلکہ ان تمام امور کے علاوہ انہوں نے فارسی ادب کے شہ پاروں کو ہندوستانی مروجہ زبانوں میں ترجمہ کرانے میں اہم اور کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ بہت سی تیموری خواتین اور شہزادیاں کتب بینی کا شغف رکھتی تھیں، اسی لئے فارسی کی نفیس کتب کی جمع آوری کو اپنا ایک اہم فرض سمجھتے ہوئے عظیم کتب خانوں کی فراہمی بھی کی۔ ایرانی مہاجر تیموری بادشاہوں کے فارسی زبان و ادب کے تئیں توجہ اور دلدادگی کے سبب قدیم خطی نسخوں کو ہدیہ کے طور پر بادشاہوں اور درباری اشخاص کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ اس طرح ایک قابل توجہ تعداد میں کتب کی جمع آوری ہو گئی۔[۲۶]

بایزید بیات اپنی کتاب ''تذکرہ ہمایون و اکبر'' میں ایک ایسی لائبریری کا ذکر کرتا ہے جو گلبدن بیگم کے ہاتھوں سجی جس میں بہت سے نفیس اور بیش بہا کتب اور نسخے محفوظ تھے۔[۲۷] جہانگیر کی ایرانی بیوی نور جہاں بیگم کو بھی کتب سے والہانہ دلچسپی تھی۔ اپنے ذاتی مطالعہ کے لئے اس نے بھی ایک کتابخانہ تعمیر کروایا۔ شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا نے کتب خانوں کے علاوہ بہت سے عام المنفعہ خدمات جیسے مساجد، باغوں، مدارس اور عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر کرائی۔

ایک اور بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ماخذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغلوں، خاص کر شاہ جہاں، کے وقت میں فارسی کے بیشتر اہم اور نایاب نسخے دربار میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ جہاں آرا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شاہی کتب خانے میں کسی بھی کتاب کے داخلے سے پہلے وہ خود بہ نفس نفیس

---

[۲۶] محمد صالح کنبوہ، عمل صالح: ج ۱، ص ۳۴۰

[۲۷] بایزید بیات، تذکرہ ہمایون و اکبر: ص ۳۷۷

ان کتب پر شاہی مہر لگاتی اور کتابوں کی تاریخ آمد کو بھی اس پر رقم کرتی تھی[۲۸]۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء بھی ادبی و علمی ذوق و کمال سے سرشار تھی اور خطی نسخوں میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس امر کے لئے اس نے اپنے والد کے محل میں ایک بڑی لائبریری کا اہتمام کیا تھا اور وقت کے اچھے اور مشہور خوشنویسوں کو نسخوں کی نقل کے لئے باقاعدہ طور پر تنخواہوں پر رکھا گیا تھا اور خود زیب النساء ان پر نظارتی فرائض انجام دیتی تھی۔ علاوہ ازیں بہت سے ماہرین کو مختلف کتب کے ترجمے پر مامور کیا گیا تھا۔[۲۹]

مدارس و مکاتب کی تعمیر: مغل خواتین اور شہزادیوں نے اپنے اسلاف کی پیروی کرتے ہوئے بہت سے مدارس و مکاتب قائم کئے جس میں مختلف علوم کی تدریس و تعلیم کے علاوہ خاص کر فارسی زبان کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔ اکبر کی دایہ ”ماہم انگہ“ نے، جو خود ایک عالمہ و فاضلہ تھی اور علم وادب کی دلدادہ تھی، قلعہ معلی کے قریب ایک مدرسہ کی تعمیر کروائی جس کا نام ”دین پناہ“ رکھا گیا۔[۳۰] اس مدرسے کی ۹۶۹ھ میں کی تعمیر نو کی گئی جس پر ایک کتبہ بھی نصب ہوا جس میں ماہم انگہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ جہاں آرا بیگم نے آگرہ اور شاہ جہاں کی بیوی اعزاز النساء بیگم نے دہلی میں ۱۰۶۰ھ میں اپنی تعمیر کردہ مساجد کے قریب مدارس قائم کئے۔[۳۱]

فارسی زبان وادب کی تعلیم: دربار سے وابستہ بہت سی خواتین خود مقام تعلم میں تھیں جس سے فارسی کی ترویج و اشاعت پر گہرا اور مثبت اثر مرتب ہوا۔ جیسے طالب آملی کی بہن ستی النساء بیگم جو طبابت کے علاوہ شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا کو فارسی زبان اور قرآن پاک کی تعلیم بھی دیتی تھی۔ اس فاضل خاتون کی تعریف میں وقت کے مشہور و معروف مؤرخین محمد صالح کنبوہ مصنف ”شاہ جہاں نامہ“ اور ملا عبد الحمید لاہوری صاحبِ ”پادشاہ نامہ“ نے ستی النساء بیگم کو ”رابعۂ دوم“، ”صدر النساء“ اور ”عفیفہ شریعہ“ جیسے القاب سے نوازا ہے۔

شعر و شاعری اور عام المنفعہ خدمات کے علاوہ مغل شہزادیوں کو فن خطاطی اور خوشنویسی میں

---

(۲۸) آنہ ماری شیمل: ص ۳۲۰

(۲۹) مہری شاہ حسینی، زنان پارسی گوی ہفت شہر عشق: ص ۸۴۶

(۳۰) محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی؛ تاریخ فرشتہ: ج ۲، ص ۱۷۵

(۳۱) محمد صالح کنبوہ، عمل صالح: ج ۲، ص ۱۱۵

بھی دلچسپی تھی۔ نمونہ کے طور پر زیب النساء بیگم ایرانی طرز تحریر میں بھرپور واقفیت اور مہارت رکھتی تھی، اسی مہارت کو دیکھتے ہوئے مہدی بیانی مؤلف ''احوال وآثار خوشنویسان'' میں رقم طراز ہے: ''از خطوط جز نستعلیق، نسخ و شکستہ راخوش می نوشت و بہ ترفیع حال اہل فضل و ھنر می کوشید و جمعی از دانشمندان و شاعران و منشیان و خوشنویسان در سایۂ عنایت او می زیستند و بعضی کتابہا ورسالات بہ نام وی پرداختہ اند۔'' [۳۲] (خط نستعلیق کے علاوہ [زیب النسا] نسخ اور شکستہ خط میں مہارت رکھتی تھی اور اہل فضل و ہنر کی زندگی کو بہتر بنانے میں کوشاں رہتی تھی ۔ کچھ دانشمند، شاعر، منشی اور خوشنویسوں کی جماعت اس کی سرپرستی میں گذر معاش کرتے تھے اور کچھ کتابوں اور رسالوں کو بھی اس کے نام معنون کر دیتے تھے)۔

تاریخ نویسی بھی اس دور کا ایک طرۂ امتیاز ہے۔ اس دور کی اہم فارسی تاریخ'' گلبدن نامہ'' یا ''ہمایوں نامہ'' ہے جو گلبدن جیسی صاحب فہم و فراست شہزادی کی بہترین علمی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ یہ کتاب بابر اور ہمایوں کے عہد کے وقائع کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جسے نہایت رواں اور سلیس فارسی میں لکھا گیا ہے۔ڈاکٹر اصغر آفتاب اپنی کتاب ''تاریخ نویسی در ہند وپاکستان'' میں گلبدن نامہ کی اہمیت اور افادیت سے روشناس کراتے ہوئے لکھتے ہیں: ''در طول تاریخ ھزار سالۂ تاریخ ادبیات فارسی شبہ قارہ ہند وپاکستان، نخستین زنی است کہ اثری ارزندہ و در عین حال پایندۂ تاریخی بہ زبان فارسی از خود بہ یادگار گذاشت، البتہ می بایست این نکتہ را در نظر گرفت کہ اگرچہ زبان این اثر فارسی آمیختہ با کلمات و اصطلاحات مغولی و ھندی است با این حال با مطالعۂ این اثر می توان چنین استنباط کرد کہ مولف بہ خوبی از زبان فارسی رائج در عصر گورکانی بہرہ بردہ و با توانایی خود در خلق این اثر علاقۂ خود و دستگاہ حکومتی گورکانی بہ زبان و ادبیات فارسی رانشان دادہ است''۔ (ہندوستان و پاکستان کے ہزار سالہ فارسی تاریخ ادب میں [گلبدن بیگم] پہلی ایسی خاتون ہیں جنھوں نے فارسی زبان میں گراں قدر اور یادگار زمانہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اگرچہ اس کتاب کے متن کو پڑھنے سے منگولی اور ہندی الفاظ وتراکیب کی آمیزش کا احساس ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولفہ کا تیموری دور کی مروجہ فارسی پر مکمل عبور تھا اور اس کتاب کو تخلیق کرکے مولفہ نے فارسی زبان وادب کے تئیں اپنی ذاتی اور حکومتی میلان کی بھی

---

[۳۲] مہدی بیانی؛ احوال وآثار خوشنویسان: ج۱، ص ۲۲۳

نشاندہی کی ہے)

ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ درباری شہزادیاں اور خواتین تصوف اور عرفان سے بھی تعلق خاطر رکھتی تھیں۔ ہندوستان میں زیادہ تر عرفا اور صوفیا ایران سے ہجرت کر کے آئے تھے یا ان طریقتوں کے پیروکار تھے جن کا جنم ایران میں ہوا لہٰذا ان کی تصانیف میں ایران اور وہاں کے ماحول کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ اسی لئے تصوف بذات خود ایک پیش خیمہ بن گیا فارسی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے اور ہندوستان کی درباری خواتین اس کی تعلیم اور گہرائیوں سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ مثال کے طور پر جہاں آرا بیگم کی کوششوں سے تصوف کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں جس میں مثنوی معنوی مولانا روم پر متعدد تصانیف شامل ہیں۔ علاوہ ازیں جہاں آرا اپنے بھائی دارا شکوہ کے زیر اثر سلسلۂ قادریہ سے وابستہ ہوگئی اور مشائخ چشتیہ کے اخبار و کرامات کے سلسلے میں "مونس الارواح" جیسی گراں قدر تصنیف پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس نے دیباچہ میں یہ واضح کر دیا کہ کتاب کے نام کا وجہ انتخاب خواجہ معین الدین کی کتاب "انیس الارواح" سے متأثر ہے۔ مونس الارواح کا آغاز اپنے پیر دستگیر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے کیا ہے، علاوہ ازیں آپ کے مریدین حضرت قطب الدین بختیار کاکی، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ نظام الدین محمد بدایونی اور شیخ نصیر الدین محمود لودھی کے ذکر اور آخر میں بیگم صاحبہ نے اپنے اجمیر کا سفر اور خواجہ صاحب کے روضے تک پہنچنے اور اپنی کیفیت و خدمات کو بیان کیا ہے۔

جہاں آرا کا تصوف اور مشائخ صوفیہ کے سلسلے میں دوسرا کارنامہ "رسالہ صاحبیہ" ہے جس میں ملا شاہ چشتی اور ان کے مریدین کے احوال ہیں۔ اس نے اس رسالہ کے تتمہ میں اپنے احوال بھی رقم کئے ہیں۔[۳۳] رسالہ کی ابتدا میں شہزادی نے اس کو تصنیف کرنے کی وجہ بیان کی ہے کہ اگرچہ مولانا شاہ کے اوصاف و محاسن ان گنت ہیں لیکن صرف عقیدت مندی اور سعادت کے حصول کی غرض سے یہ رسالہ لکھ رہی ہوں۔ اس کے بعد مولانا شاہ کی پیدائش، علم کا حصول، میاں میر کے حلقۂ ارادت کا ذکر، مولانا شاہ کے معمولات و عبادات، آپ کے لباس و خوراک، سیر و تفریح، کرامات اور آپ کے مریدین کا تفصیلی ذکر ہے۔

---

[۳۳] محمد دارا شکوہ؛ اوپانیشاد (سر اکبر): ج۱، ص۱۵۵-۱۵۹

یہ امر مسلم ہے کہ ہندوستان کے شاہان تیموریہ کی علم دوستی اور حسن مذاق کا یہ ثبوت ہے کہ جہاں انھوں نے حکومت کا نظم و نسق سنبھالنے اور ملک داری کے لیے اپنے شہزادوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا، وہیں انھوں نے اپنی شہزادیوں کو بھی اس نعمت سے محروم نہیں رکھا اور نہ صرف ان کے دربار میں علم و فن کی مجالس قائم کیں بلکہ ان کے خلوت کدوں میں بھی علم و ادب کی بزم آراستہ ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فتوحات کی معرکہ آرائیوں اور جنگ جانشینی کی خون آشامیوں کے باوجود تیموریوں نے خلوت و جلوت دونوں کو علم و ہنر کی شمع سے منور کیا۔

منابع و مآخذ:

۱۔ آذر بیگدلی، لطف علی، آتش کدہ آذر: بہ تصحیح میر ہاشم محدث، انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۷۸ش

۲۔ آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانۂ عامرہ: تصحیح ناصر نیکو بخت و شکیل اسلم بیک، پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، تہران، ۱۳۹۰ش

۳۔ آفتاب اصغر، تاریخ نویسی در ہند و پاکستان، خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، لاہور، ۱۳۶۴ش

۴۔ افشار ایزدی، محمود، افغان نامہ: مجموعہ انتشارات ادبی و تاریخی موقوفات محمود افشار یزدی، تہران ۱۳۶۱ش

۵۔ امیری ہروی، سلطان محمد فخری، تذکرہ روضۃ السلاطین و جواہر العجایب، تصحیح و تحشیۂ سید حسام الدین راشدی، سندی ادبی بورڈ، حیدر آباد پاکستان، ۱۹۶۸ء

۶۔ اوحدی بلیانی، تقی الدین محمد، تذکرہ عرفات العاشقین و عرصات العارفین: اساطیر، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران، ۱۳۸۸ش

۷۔ بدایونی، عبد القادر، منتخب التواریخ: بہ تصحیح مولوی احمد علی صاحب با مقدمہ و اضافات توفیق سبحانی، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ۱۳۸۰ش

۸۔ براؤن، ادوارد، تاریخ ادبیات ایران (از صفویہ تا عصر حاضر): ترجمہ بہرام مقدادی، تحشیہ و تعلیق ضیاء الدین سجادی و عبد الحسین نوائی، انتشارات مروارید، تہران، ۱۳۷۵ش

۹۔ بیات، بایزید، تذکرہ ہمایون و اکبر: بہ سعی و تصحیح محمد ہدایت حسین، انتشارات اساطیر، تہران، ۱۳۸۲ش

۱۰۔ بیانی، مہدی، احوال و آثار خوشنویسان: جلد ۱ و ۲، انتشارات علمی، تہران، ۱۳۶۳ش

۱۱۔ تتوی، احمد و آصف خان قزوینی، تاریخ الفی: بہ تصحیح غلام رضا طباطبائی مجد، جلد ہشتم، انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۸۲ش

۱۲۔ ثواقب، جہاں بخش، زنان فرمان رواو معرفی رسالہ ای درباره زنان حکومت گرای ایران: انتشارات نوید شیراز، شیراز، ۱۳۸۶ش
۱۳۔ جعفر حلیم، سید حسین، شرح احوال و آثار عبد الرحیم خان خانان و خدمات او برای پیشرفت ادبیات فارسی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۳۷۱ش
۱۴۔ حسن خان، سید علی، صبح گلشن، بہ اہتمام مولوی عبد المجید خان، مطبع شاہ جہانی، بھوپال، ۱۲۹۵ھ
۱۵۔ حکمت، علی اصغر، سرزمین ہند (بررسی تاریخی و اجتماعی و سیاسی و ادبی ہندوستان از ادوار باستانی تا عصر حاضر): چاپخانہ دانشگاہ، تہران ۱۳۳۷ش
۱۶۔ جہاں آرا بیگم، مونس الارواح، مقدمہ و حواشی ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی: ۲۰۲۱ء
۱۷۔ خافی خان، محمد ہاشم، منتخب اللباب: انجمن آسیایی بنگال، کلکتہ، ۱۸۶۹ء
۱۸۔ داراشکوہ، محمد، اوپانیشاد (سر اکبر): ترجمہ محمد داراشکوہ فرزند شاہ جہان از متن سانسکریت بہ سعی و اہتمام دکتر تاراچند و سید محمد رضا جلالی نائینی، جلد اول، انتشارات محمد علی علمی، تہران ۱۳۶۸ش
۱۹۔ رجبی، محمد حسن، مشاہیر زنان ایرانی و پارسی گوی از آغاز تا مشروطہ، انتشارات صداو سیمای جمہوری اسلامی ایران سروش، تہران ۱۳۷۴ش
۲۰۔ رحمانی، ماگہ، پردہ نشینان سخن گو: بازنویسی فاطمہ صادقی، انتشارات نگاہ معاصر، تہران، ۱۳۹۳ش
۲۱۔ سلیم جہانگیر، نور الدین محمد، توزک جہانگیری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء
۲۲۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، بزم تیموریہ: ج ۲، طبع اول، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۳ء
۲۳۔ شاہ حسینی، مہری، زنان پارسی گوی ہفت شہر عشق: انتشارات مدبر، موسسہ انتشارات مدبر، تہران، ۱۳۸۳ش
۲۴۔ شاہنواز خان، صمصام الدولہ، مآثر الامرا: مصحح مولوی عبد الرحیم، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۸۰۹ء
۲۵۔ شیمل، آنہ ماری، در قلمرو خانان مغول: ترجمہ فرامرز نجد سمیعی، انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۸۶ش
۲۶۔ عبد الرشید خواجہ، تذکرہ شعرای پنجاب: لاہور، ۱۳۴۶ش
۲۷۔ مخزن الغرائب (شیخ احمد علی خان ہاشمی سندیلوی: مخزن الغرائب، بہ اہتمام دکتر محمد باقر، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء)

مطبع معارف کی اشاعتی خدمات

طلحہ نعمت ندوی

talhanemat3@gmail.com

دارالمصنفین کی خدمات کے اتنے وسیع گوشے ہیں کہ اب تک سب کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے۔ انہیں میں ایک مطبع معارف سے دارالمصنفین کے سلسلے کے علاوہ دوسری کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

جس وقت دارالمصنفین کا آغاز ہوا اس وقت تک گرچہ اشاعتی اداروں کا آغاز ہو چکا تھا جو کسی دوسرے مطبع میں کتابیں چھپوا کر اسے شائع کرتے، لیکن آج کل کی طرح اس کی اتنی کثرت نہیں تھی، اور ابھی انیسویں صدی کا قدیم رواج باقی تھا جب دارالاشاعت کے بجائے مطبع ہی کا نام کتاب کے سرورق پر ہوتا تھا۔ آج کی طرح یہ آسان نہیں تھا کہ کوئی شخص کسی ادارے کا نام رکھ کر کسی دوسرے مطبع میں کتابیں چھاپ کر شائع کر دے، اور مطبع کا قیام بھی ہر ایک کے لئے آسان نہیں تھا۔ اس لئے اس دور کے مطابع آج کے دارالاشاعت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اعظم گڑھ شہر میں بیسویں صدی یعنی ۱۹۰۰ تک تین، چار پریس تھے، جس کا ذکر پروفیسر نادر علی خاں نے "ہندوستانی پریس" (مطبوعہ علی گڑھ) میں کیا ہے۔ ممکن ہے مطبع معارف کے قیام تک یعنی پندرہ سال کی مدت میں ایک دو پریس اور قائم ہوئے ہوں، لیکن وہ شاید اتنے معیاری نہ تھے کہ معارف جیسے رسالے کی طباعت ان کے ذریعہ بہتر انداز پر ہوتی۔

جب لکھنؤ میں الندوہ قائم ہوا تو لکھنؤ میں پریس کی اتنی تعداد تھی کہ الندوہ پریس قائم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اور الندوہ رسالے کے علاوہ علامہ شبلی کی تصانیف، ندوہ اور اکابرین ندوہ کے رسائل وکتب دوسرے مطابع میں ہی چھپتے رہے۔ چنانچہ بیشتر الندوہ کے شمارے آسی پریس لکھنؤ میں اور کبھی کبھی مطبع محمود المطابع میں چھپے۔

۱۹۱۵ میں دارالمصنفین کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اپنے پریس کے بغیر "معارف" کی اشاعت ممکن نہیں تھی، اس لئے "مکاتیب شبلی" اور "ارض القرآن" مطبع شاہی لکھنؤ سے شائع

کروا کر دارالمصنفین سے شائع کی گئیں اور اشاعت کتب کا سلسلہ شروع کر دیا گیا لیکن معارف معرض التوا میں رہا۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے:

خط (سید صاحب بنام حکیم عبدالقوی دسنوی) سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکاتیب شبلی، ارض القرآن سے پہلے چھپ گئی تھی، چنانچہ اس کی اشاعت کا اعلان بھی جولائی ۱۹۱۶ء کے معارف کے مطبوعات جدیدہ کے تحت میں موجود ہے۔ مگر دارالمصنفین کے سلسلۂ مطبوعات کا پہلا نمبر ارض القرآن پر ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارض القرآن پہلے شائع ہوئی۔ اس وقت تک معارف پریس قائم نہیں ہوا تھا، اور یہ دونوں کتابیں مطبع شاہی لکھنؤ میں چھپی تھیں۔[۱]

یہ اشاعت راقم کی نظر سے بھی گذری ہے۔ مکاتیب شبلی جلد دوم کے سرورق پر سلسلۂ دارالمصنفین ۲ لکھا ہے، اور اخیر میں تحریر ہے: "باہتمام محمد عابد علی خاں مالک مطبع شاہی لکھنؤ میں چھپ کر دفتر دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی"۔ لیکن کلیم صفات اصلاحی نے مطبوعات دارالمصنفین کی فہرست میں سب سے پہلا نام شعر العجم جلد دوم کا لکھا ہے اور سنہ اشاعت ۱۹۱۷ لکھی ہے[۲]۔ معارف پریس جون ۱۹۱۶ میں قائم ہوا۔ اسی میں پہلے مکاتیب شبلی جلد دوم چھپی پھر معارف کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔[۳]

اس کے بعد دارالمصنفین کی تمام کتابیں معارف پریس میں ہی شائع ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ پریس سے دوسروں کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا گیا اور سیکڑوں کتابیں اس سے چھپ کر نکلیں جو دارالمصنفین کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ معارف پریس کا معیار طباعت اتنا بلند تھا کہ اچھے اچھے مصنفین اور اہل قلم بڑے شہروں، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ اور کلکتہ و بمبئی کے مطابع کو چھوڑ کر اعظم گڑھ جیسے چھوٹے شہر کے اسی مطبع میں اپنی کتابیں چھپوانے کو ترجیح دیتے۔ افسوس کہ دارالمصنفین کی اس خدمت کی طرف اب تک توجہ نہیں دی جا سکی۔ حالاں کہ جب اس سے چند دہائیوں قبل تک پریس اور مطابع کی اپنی اہمیت تھی، اور کتابوں کی اشاعت میں اصل کردار

---

[۱] حیات سلیمان، طبع اول دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ب۔ت، ص ۱۰۴
[۲] دارالمصنفین کے سو سال، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۴۵۳
[۳] حیات سلیمان، ص ۱۰۴

انہیں مطابع کا تھا، جس کی وجہ سے ان کی تاریخ محفوظ کی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ دارالمصنفین کی اس اہم خدمت کو نظر انداز کیا جائے۔

معارف پریس میں دوسری کتابوں کی اشاعت سے ایک طرف اس کے وسائل میں بھی کچھ اضافہ ہو جاتا تھا دوسری طرف اہل علم کے ہاتھوں میں اچھی اور معیاری مطبوعہ کتابیں پہنچتی تھیں۔ گرچہ اس کی صراحت نہیں ہے لیکن ان مطبوعہ کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے ایسا لگتا ہے کہ طباعت سے پہلے دارالمصنفین ہی میں ان کی کتابت اور پورے اہتمام کے ساتھ ان کی تصحیح بھی کی جاتی تھی۔

کلیم صفات اصلاحی نے اپنی کتاب "دارالمصنفین کے سو سال" میں دارالطباعت اور دارالاشاعت کے الگ الگ عنوان سے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور دارالمصنفین کی قدیم تحریروں کی روشنی میں ان دونوں شعبوں کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ مطبع میں عہد بہ عہد کیا تبدیلی اور کیا ترقی ہوئی اور کون کون اس میں خدمت پر مامور رہے اور کس طرح مشینیں آئیں، ان سب کا تفصیلی ذکر اس میں دارالطباعت کے زیر عنوان موجود ہے۔

پریس کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:

> اسی احاطہ میں ایک پریس قائم کیا گیا ہے، جو ابھی ابتدائی مراحل میں ہے ۱۹۱۷ تک امید ہے کہ یہاں ایک مشین آجائے۔ اس وقت دارالاشاعت کو اپنی کامیابی کے لئے بہترین موقع ہاتھ آجائے گا۔ تمام ہندوستان میں خالص مصنفین کے لئے بغیر تاجرانہ ارادہ ونیت کوئی پریس قائم نہیں۔ اگر ہماری کامیابی ہمارے حوصلہ کے مطابق ہوئی تو امید ہے کہ یہ سب سے بڑی کمی دارالاشاعت سے پوری ہو جائے گی۔ [۴]

دارالمصنفین میں اشاعت کے بھی دو سلسلے معلوم ہوتے ہیں، جو مطبع معارف میں دوسروں کی کتابوں کے علاوہ تھے۔ ایک تو وہ جو خود رفقائے دارالمصنفین کے قلم سے نکلتیں یا علامہ شبلی کی کتابیں۔ دوسرے وہ کتابیں جو دوسروں کی ہیں اور ادارے نے اپنے خرچ پر انہیں شائع کیا۔ ان دونوں قسم کی کتابوں پر دارالمصنفین اور مطبع معارف دونوں لکھا ہوتا تھا یا پھر سلسلہ دارالمصنفین کا

---

[۴] سالانہ رپورٹ بحوالہ دارالمصنفین کے سو سال، ص ۳۹۰

نمبر درج ہوتا تھا، جب کہ دوسروں کے خرچ پر چھپنے والی کتابوں پر صرف مطبع معارف یا معارف پریس لکھا جاتا تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے ان مطبوعات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار شذرات میں تحریر فرمایا ہے:

> دارالمصنفین نے اپنی بائیس برس کی زندگی میں سیرت نبوی کی پچاس اور سلسلہ سے باہر کی کتابوں کو ملا کر ستر کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ فلسفہ، ادب، تاریخ، سوانح اور دوسرے متفرق مضمونوں پر ہیں۔[۵]

طباعت واشاعت کا یہ فرق بعد میں بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ دارالمصنفین نے مولانا حمید الدین فراہی کے عربی رسائل تو شائع کئے تھے لیکن جب علامہ عبد العزیز میمنی کی عربی کتاب "ابو العلاء وما الیہ" کی اشاعت کی بات آئی تو عربی کتاب کی معیاری طباعت معارف پریس میں ممکن نہیں تھی۔ اب تک جو کتابیں چھپی تھیں وہ فارسی خط میں تھیں۔ اس لئے اسے سید صاحب نے اپنے رفیق شیخ محب الدین الخطیب مصری کے پریس المطبعۃ السلفیہ قاہرہ میں چھپوایا۔ اس کے سر ورق کے بالکل اوپر لال روشنائی سے "سلسلۃ دارالمصنفین رقم ۲۹" لکھا ہے، اور مصنف کے نام کے بعد لکھا ہے: وطبع علی نفقۃ دارالمصنفین فی اعظم کرہ (الھند)۔

البتہ دارالمصنفین نے کوئی قدیم کتاب نہیں شائع کی۔ جو کتابیں چھپیں وہ یا تو حال کے مصنفین کی تھیں یا کسی نے ان کو مرتب کیا تھا۔ اگر مطبع منشی نول کشور کی طرح دارالمصنفین بھی عربی، فارسی اور اردو کی قدیم کتابوں کو اہتمام سے شائع کرتا تو یہ سلسلہ اور زیادہ مفید ہوتا۔

کلیم صفات اصلاحی نے مطبوعات دارالمصنفین کے بعد ایک الگ عنوان قائم کرکے ایسی کتابوں کی ایک فہرست دی ہے اور لکھا ہے: "ممتاز و مشہور مصنفین کی وہ قابل ذکر تصنیفات جو دارالمصنفین کے زیر اہتمام شائع ہوئیں مگر یہاں کے سلسلہ میں شامل نہیں"۔[۶] یہ کتابیں وہی ہیں جو مطبع معارف سے شائع ہوئیں ہیں۔ ان میں علامہ حمید الدین فراہی کی بیشتر عربی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی کی بھی چند کتابیں ہیں جن میں سید صاحب کے دادا مولوی حکیم سید محمدی

---

(۵) شذرات سلیمانی ۳/ ۱۲۷

(۶) دارالمصنفین کے سو سال، ص ۴۶۴

دیسنوی کا ایک فارسی رسالہ ”نور محمدی“ بھی ہے جو تصوف کے موضوع پر ہے اور انہوں نے اپنے شیخ حضرت نور محمد انبیری بہاری کی نسبت سے یہ نام رکھا ہے۔ اس کے آخری صفحہ میں فارسی ہی میں سید صاحب نے اپنے دادا کے حالات بھی لکھے ہیں۔ دارالمصنفین کے سو سال میں اس کا نام ”مجموعہ رسائل نور محمدی“ لکھا ہے، لیکن در حقیقت اس کا اصل نام ”نور محمدی“ ہے جو کتاب کے سرورق پر ثبت ہے۔

اس سلسلہ میں سید صاحب ۱۳/ اگست ۱۹۳۰ کے ایک مکتوب بنام سید عبدالحکیم دیسنوی میں لکھتے ہیں:

> میں نے حکیم محمدی صاحب مرحوم کا ایک مختصر رسالہ فارسی (۶۰ صفحے) سلسلۂ اولیاء کے حالات میں چھپوایا ہے۔ اس پر ساٹھ ستر روپے خرچ آئے ہیں۔ یہ کیوں کر نکلے۔ ۸؍ فی نسخہ قیمت ہے۔ صرف دو سو نسخے چھپوائے ہیں۔ کہئے، آپ کے مدرسہ و لائبریری کو کے نسخے ملیں۔ تمام اولاد حکیم محمدی سے ۵؍ سیکڑہ وصول کروں گا تو ساٹھ ہو جائیں گے، یہ نسخہ تو اچھا ہے۔ (۷)

مطبع معارف ہی سے ہیرلڈ لیمب کی ”تیمور“ شائع ہوئی جس کے مترجم جناب عنایت اللہ مشہور اہل قلم تھے۔ اس کے سرورق پر ”باہتمام مولوی مسعود علی ندوی در مطبع معارف اعظم گڈھ چاپ شد“ درج ہے۔

یہیں سے ایک سکھ فاضل گوردت سنگھ دارا، ایڈیٹر انڈیا لندن، کے قلم سے اردو میں ”رسول عربی“ شائع ہوئی، جس کا مقدمہ سید صاحب کے قلم سے ہے اور اس پر لندن تحریر ہے، گویا ان سے سید صاحب کی ملاقات لندن میں ہوئی ہو گی اور وہیں سے سید صاحب نے یہ مقدمہ لکھ کر طباعت کے لئے کتاب روانہ کی ہو گی۔

سید صاحب کی ”عربوں کی جہاز رانی“ بھی دارالمصنفین سے نہیں بلکہ ممبئی کے اسی ادارے سے شائع ہوئی تھی جہاں سید صاحب نے یہ خطبات دیے تھے۔ سید صاحب نے اس کی اشاعت کی اطلاع دیتے ہوئے شذرات میں لکھا:

> ان دنوں مطبع معارف سے دو نئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں، ایک ”عربوں کی جہاز رانی“

---

(۷) قلمی مکتوب عکس مملوکہ راقم

ایڈیٹر کے قلم سے۔ یہ دراصل وہ چند خطبے ہیں جو مارچ ۱۹۳۱ میں بمبئی میں سنائے گئے تھے، اور اب ان کو بمبئی کی اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن مذکور کے لائق سکریٹری آصف فیضی ایم اے نے شائع کرایا ہے۔[۸]

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن تو نہیں مل سکا البتہ دوسرا ایڈیشن، جو کچھ اضافوں کے ساتھ اسی مطبع سے شائع ہوا تھا، وہ پیش نظر ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر سید شہاب الدین دیسنوی کی تمہید ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے "علامہ سید سلیمان ندوی کے ان خطبات کا مجموعہ "اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن" بمبئی کی طرف سے پہلی بار ۱۹۳۵ میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع کیا گیا تھا، اور اب تئیس سال کے بعد اس کا نیا ایڈیشن پیش کیا جارہا ہے"۔

مذکورہ بالا شذرات میں سید صاحب نے دو کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مطبع معارف سے شائع ہوئیں۔ دوسری کے متعلق لکھتے ہیں:

دوسری کتاب "چینی مسلمان" ہے، جس کو چین کے نوجوان عالم وادیب بدرالدین چینی صاحب بی اے (جامعہ) نے اپنے ہندوستان کے زمانہ قیام میں لکھا، اور مطبع معارف نے چھاپا ہے۔ اس میں سب سے پہلی دفعہ چینی مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے ہر قسم کے قومی، مذہبی، تعلیمی، علمی اور سیاسی حالات نہایت مستند ذریعوں سے لکھے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے اس ملک کے دور افتادہ مسلمان بھائیوں کے حالات سے جو دلچسپی ہے، اس کی بنا پر یہ توقع بیجا نہیں کہ وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور پڑھیں گے۔ ضخامت گو تین سو صفحوں سے زیادہ ہے مگر قیمت صرف ڈیڑھ روپے رکھی گئی ہے"۔[۹] اس کتاب پر سید صاحب کا مقدمہ ہے۔

مشہور شاعر شاد عظیم آبادی کی ضخیم کتاب "حیات فریاد" بھی مطبع معارف سے شائع ہوئی۔ اس کے سرورق پر نیچے میں درج ہے:"باہتمام مسعود علی ندوی مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ میں چھپی"۔ اس پر سید صاحب کا دو صفحات کا مقدمہ بھی ہے۔ اور شروع میں عرض حال کے عنوان سے فرزندِ مصنف سید حسین علی کی تمہید ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

مرحوم (شاد عظیم آبادی) کو اس کتاب کی طباعت واشاعت کی اس قدر عجلت تھی کہ ہنوز تکمیل کو

---

[۸] شذرات سلیمانی ۳/ ۱۰۲

[۹] شذرات حوالہ سابق

نہیں پہنچی تھی کہ کئی مطبع والوں سے یہاں گفتگو کی ٹھہری۔ پھر جناب مولانا سید سلیمان صاحب کو اس کی طباعت کے بارے میں خط لکھا۔ دادا صاحب حضرت فریاد کی تصویر کا بلاک بنوا کر پانسو کاپیاں چھپوا کر رکھ لیں۔ اخیر میں یہ طے فرمالیا تھا کہ مطبع معارف میں یہ کتاب چھپے گی۔ اسی وجہ سے میں نے جناب مولانا سید سلیمان صاحب کو طباعت کی جانب متوجہ کیا، اور مطبع معارف میں چھپوانے کا بندوبست کیا۔ گویا حضرت کی وصیت پوری کی......میں جناب مولانا سید سلیمان صاحب کا دل سے شکر گذار ہوں کہ جناب نے بخوشی یہ تمام زحمت اپنے سر لی۔[۱۰]

شاد عظیم آبادی کی خودنوشت، جو خود ان کے قلم سے ہے لیکن ان کے شاگرد مسلم عظیم آبادی کی زبانی لکھی گئی ہے "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" از مسلم عظیم آبادی بھی مطبع معارف ہی سے شائع ہوئی۔ مولانا سید نجم الہدیٰ ندوی دیسنوی کی کتاب "سادات وملوک دیسنہ" بھی معارف پریس ہی سے تقریباً ۱۹۵۵ میں شائع ہوئی۔

مولانا عبد الماجد ندوی کی "تصوف اسلام" بھی مطبع معارف ہی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر سلسلۂ آصفیہ تحریر ہے اور اخیر میں "باہتمام مولوی مسعود علی ندوی در مطبع معارف اعظم گڑھ بچاپ رسید" تحریر ہے۔ یہ کتاب بالکل ابتدائی دور میں یعنی ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۲) میں چھپ گئی تھی۔ الیاس احمد صاحب ایم اے، ال ال بی، کا شعری مجموعہ "بہار" پر بھی معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۴۳ تحریر ہے۔

مولانا عبد السلام ندوی کی "القضاء فی الاسلام" بھی سلسلہ دار المصنفین میں شامل نہیں ہے اور اس کے سرورق پر بھی وہی جملہ مذکور ہے، یعنی "باہتمام مولوی مسعود علی ندوی در مطبع معارف طبع ۱۹۲۹ء"۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے سفر نامہ "الفوز العظیم" پر بھی مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ پہلے معارف میں شائع ہوا تھا پھر شاید ان کے اعزہ کے خرچ پر رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔

علامہ سید سلیمان ندوی کا رسالہ "اہل سنت والجماعت" بھی دار المصنفین کے سلسلے میں شامل نہیں ہے بلکہ اس پر یہ صراحت ہے: "جس کو فاضل غیور جناب مولوی حکیم غلام غوث صاحب

---

[۱۰] حیات فریاد، ص ۲

طبیب ریاست خیر پور (سندھ) نے تعمیم فائدہ کی غرض سے چھپوا کر شائع کیا۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۔۱۳۳۶ھ"۔ اس رسالہ کا ایک اور ایڈیشن خود شہر اعظم گڑھ کے دوسرے مطبع سے شائع ہوا تھا۔ اس پر تحریر ہے "باہتمام محمد اویس وارثی مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڑھ"۔

جگر مرادآبادی کا مجموعہ کلام "داغ جگر" بھی مطبع معارف ہی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر اوپر یہ تحریر ہے: "سلسلہ بزم ادب نمبر ا" اور اخیر میں "در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع شد" مذکور ہے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کی ایک دو کتابوں کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی مولانا کی اکثر کتابیں مطبع معارف ہی سے چھپی ہیں۔ ان کے سرورق پر "سلسلہ آصفیہ" اور اخیر میں "مطبع معارف" یا "در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع شد" لکھا ہے۔ وہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

۔پیام امن ۔فیہ ما فیہ ،فارسی ،ملفوظات مولانا جلال الدین رومی ترتیب مولانا عبد الماجد دریابادی، "باہتمام مولوی مسعود علی در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع گردید"۔

۔مبادی فلسفہ ۱۹۳۱، مثنوی بحر المیت از شیخ مصحفی ترتیب مولانا عبد الماجد ہیں۔

۔سفر حجاز از مولانا عبد الماجد۔ ان کتابوں پر "سلسلہ آصفیہ" کا لفظ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ ان کی اور کتابیں بھی یہیں سے شائع ہوئیں، جن میں "حکیم الامت نقوش و تاثرات" بھی ہے لیکن اس پر دارالمصنفین کا سلسلہ نمبر نہیں ہے۔ ان کی دوسری کتاب "محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق" بھی اسی طرح شائع ہوئی تھی۔ اس پر بھی "مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ" لکھا ہے۔

مولانا سید ابو ظفر ندوی کی وہ کتابیں، جو گجرات سے شائع ہوئیں ہیں، معیاری طباعت کی وجہ سے وہ بھی مطبع معارف میں چھپوانے کو ترجیح دیتے تھے، چنانچہ ان کی "تذکرہ اقدس" ۱۹۳۴ میں مطبع معارف ہی سے شائع ہوئی۔

اعظم گڑھ کے اہل علم میں مرزا احسان احمد بی اے وکیل اعظم گڑھ کے شعری مجموعے بھی اکثر مطبع معارف ہی سے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں چند کا ذکر کلیم صفات اصلاحی کی محولہ بالا کتاب میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ "سرشک اخلاص"، ان کا رسالہ "میں اور میری ادبی صلاحیت" ۱۹۷۱ شامل ہیں۔

مولانا ہدایت علی مجددی کی ایک کتاب مطبوعہ معارف کا ذکر مذکورہ بالا کتاب میں ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "معیار السلوک ودافع الاوہام والشکوک" بھی ۱۹۳۶ میں معارف پریس ہی سے شائع ہوئی تھی۔

مخزن نجات از شرف الدین احمد خاں، جو مولانا جامی کی مرتبہ چہل حدیث کا ترجمہ ہے، پر بھی "در مطبع معارف اعظم گڑھ چاپ شد" درج ہے، البتہ سنہ طباعت درج نہیں۔ اخیر میں "جملہ حقوق محفوظ" کا جملہ بھی ہے۔

دیوان مرزا کامران فارسی، جس کو پروفیسر محفوظ الحق (پریسیڈنسی کالج کلکتہ) نے مرتب کیا اور اس پر ایک مقدمہ لکھا ہے، یہیں سے شائع ہوا تھا۔ اس پر تحریر ہے "مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ"۔

محمود ذکی کی ترجمہ کردہ کتاب "دماغی تربیت" از مسٹر جمس ایلن پر بھی "در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع شد، جملہ حقوق محفوظ" لکھا ہے۔

بیرسٹر نصیر الدین عظیم آبادی کی کتاب "حقیقت علمی شاعری" پر بھی "باہتمام مولوی مسعود علی معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی" درج ہے۔ اس پر سنہ ۱۳۴۹ھ (۱۹۰۲) بھی لکھا ہے۔ پتہ نہیں یہ سنہ تصنیف ہے یا سنہ طباعت، کیوں کہ یہ عنوان کتاب کے نیچے تحریر ہے، نیز اس کا سرورق مطبع معارف کی دوسری مطبوعات سے قدرے مختلف نظر آتا ہے۔

مشہور فاضل مہدی افادی کا مجموعہ "مضامین افادات مہدی" ۱۹۳۹ میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ اس پر بھی وہی جملہ درج ہے۔

"اسلامی قانون فوجداری"، ترجمہ "کتاب الاختیار" بھی اسی مطبع سے چھپی ہے۔ اس پر تحریر ہے: "حسب فرمائش جناب میر شریف صاحب وکیل ریاست حیدر آباد باہتمام مسعود علی ندوی در مطبع معارف شہر اعظم گڑھ مطبوع گردید"۔

جمع و تدوین قرآن از جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم، آئی سی ایس۔ اس پر بھی لکھا ہے: "در مطبع معارف پریس اعظم گڑھ طبع گردید۔ ۱۳۸۴ھ"۔

خلافت وسلطنت مولفہ ڈاکٹر امیر حسن، مترجمہ سبطین احمد بی اے علیگ۔ اس پر بھی

''مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۹'' لکھا ہے۔

کتاب الفلاحت جلد اول از علامہ ابوزکریا یحیٰ بن محمد اشبیلی، ترجمہ مولانا سید ہاشم ندوی، ۱۹۲۷ میں معارف پریس سے چھپی تھی۔

رہنمائے تاریخ اردو از حاجی محمد عبد القادر، ریٹائرڈ وکیل بنارس۔ معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی۔

گلدستہ سالک از مولوی عبد الغفار سالک کے سرورق پر تحریر ہے: ''در مطبع معارف شہر اعظم گڑھ طبع گردید ۱۹۳۱''۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی ایک دو کتابوں کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے علاوہ بھی سید صاحب کی چند کتابیں اور رسائل ہیں جو کسی دوسرے کے صرفے پر شائع ہوئے لیکن مطبع معارف ہی سے چھپے۔ ان میں حسب ذیل کتابوں کا علم ہوسکا جن پر مطبع معارف درج ہے:

رحمت عالم۔ اس کتاب کے متعلق سید صاحب کے خطوط میں جابجا ذکر ملتا ہے کہ اس کتاب کو فروخت کرکے اس کی آمدنی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک دارالاقامہ تعمیر کرانا ہے۔

لغات جدیدہ۔ یہ مطبع معارف ہی میں چھپی لیکن دارالمصنفین کے سلسلے میں شامل نہیں ہے۔

حیات مالک۔ اس پر ''مطبع معارف شہر اعظم گڑھ میں چھپی ۱۳۰۴ھ (۱۹۱۹) طبع دوم'' کے الفاظ ہیں۔ اسی سال ان کا ''خلافت اور ہندوستان'' نامی رسالہ بھی اسی مطبع سے شائع ہوا۔

یہ مطبع معارف کی مطبوعات کا ایک اجمالی ذکر ہے۔ یقیناً اس سے بہت زیادہ کتابیں ہوں گی۔ بہت سی اور کتابوں کا ذکر کلیم صفات اصلاحی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں کیا ہے جن کا ذکر اس مضمون میں نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ اس میں ایک بات تصحیح طلب ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا پہلا ایڈیشن بھی یہیں سے چھپا تھا، اس پر سلسلہ اشاعت نمبر ۱۸۲ درج ہے اس لئے وہ دارالمصنفین کے سلسلے سے الگ نہیں ہے۔

قدیم مطابع کی خدمات کا جہاں ذکر کیا جاتا ہے وہاں دارالمصنفین کے مطبع معارف کی علمی خدمت کی طرف نظر نہیں جاتی جب کہ یہ بھی دارالمصنفین کی تاریخ کا ایک روشن پہلو ہے، اور بہت اہم علمی خدمت ہے کہ اس نے کم خرچ میں معیاری کتابیں قارئین تک پہنچائیں۔

اخبار ”مدینہ“: بجنور کے چھوٹے قصبے سے عالمی افق تک

محمد علم اللہ، لندن[۱]

alamullahjmi@gmail.com

انٹرنٹ پر ہندوستان میں اردو کے حوالے سے ہونے والے کام کے بارے میں تلاش کرتے ہوئے مجھے ایک نفیس کتاب ملی۔ میگن ایٹن روب کی پرنٹ اینڈ دی اردو پبلک: مسلمز، نیوز پیپرز اینڈ اربن لائف اِن کولونیئل انڈیا (طباعت اور اردو کی دنیا: سامراجی ہندوستان میں مسلمانوں کی صحافت اور شہری تمدن، از میگن ایٹن روب، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۲۱[۲]

اس کتاب کی مصنفہ برصغیر کا پس منظر رکھنے والی نہیں ہیں، بلکہ خالص یورپ کی پروردہ ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت امریکہ میں ہوئی۔ نہ ان کی مادری زبان اردو تھی، نہ ہی وہ بجنور یا لکھنؤ و دہلی کی گلی کوچوں میں پلی بڑھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک ایسے موضوع کو ہاتھ لگایا جسے ہمارے اپنے مؤرخین، ادیبوں اور صحافیوں نے بھی یا تو نظر انداز کیا یا پھر سطحی طور پر چھوا۔ لیکن میگن نے اسے گہرائی، اتنے علمی اور منطقی انداز میں انجام تک پہنچایا ہے۔

کتاب کی ترتیب لاجواب ہے۔ یہ ایک مقدمہ، پانچ ابواب، چار ضمیمہ جات اور کتابیات و اشاریات پر مشتمل ہے۔ یہاں میں انگریزی ابواب کا اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں: فہرستِ مضامین؛ دیباچہ؛ ابتدائیہ: عوام کی ماہیت اور جہانِ اردو: مقام، زمانہ اور اجتماعی شعور کی تفہیم؛ باب اوّل:

---

[۱] محمد علم اللہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور برطانیہ کے سوانزی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ وہ کالم، نظمیں، سفر نامے اور کہانیاں تحریر کرتے رہے ہیں۔ وہ ای ٹی وی اردو، آل انڈیا ریڈیو جیسے اداروں میں صحافتی خدمات کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میڈیا کنسلٹنٹ رہ چکے ہیں۔ ان کی کتابیں ”مسلم مجلس مشاورت: ایک مختصر تاریخ“، ”کاغذ سے اسکرین تک“ اور ”ایران میں کچھ دن“ شائع ہو چکی ہیں۔

[۲] Megan Eaten Robb, Print and the Urdu Public Muslims, newspapers and urban life in colonial India, Oxford U. P., New York, 2021 (available on archive.org)

مدینہ کا دارالعوام: مسلم تہذیبی نقشے میں ایک فکری سنگِ میل کی نشاندہی؛ باب دوم: قصبہ بجنور کی بازگشت: وقت، معاشرت اور تہذیبی رَو کا معنوی منظر نامہ؛ باب سوم: اردو لیتھو گرافی: اہلِ اسلام کی بصری و فکری اختراع کی درخشاں روایت؛ باب چہارم: نقشۂ یورپ کی تفہیم: تہذیبِ مغرب کا مطالعہ چشمِ اسلام سے؛ باب پنجم: عوامی اردو اور ریاستی دھارے: لسانی فضا کے ذریعے حکومتی پالیسیوں کی مقامی صورت گری؛ اختتامیہ: عوام بطور زمان و مکان: ایک فکری وجود کی تشکیل؛ رومن رسم الخط، حوالہ جاتی ضابطہ اور استناد کی ترتیب؛ ضمیمہ جات: ضمیمہ اوّل: اصطلاحات و الفاظ کا جامع لغت نامہ؛ ضمیمہ دوم: بجنور کے انتخاب کنندگان کی اہلیت سے متعلق تاریخی تجویز (۱۹۱۳)؛ ضمیمہ سوم: مدینہ کے مدیران و اربابِ صحافت کا زمانی و تعارفی اندراج (۱۹۱۲-۱۹۴۸)؛ ضمیمہ چہارم: بہار کا موسم: حیات و امید کی علامتی نوید؛ کتابیات؛ اشاریہ۔ یہ سب کچھ ایک ہزار سے زائد ''مدینہ'' اخبار کے پرچوں، بجنور کے مقامی ریکارڈ، انگریزی رپورٹس اور دیگر اردو اخباروں کے تقابلی مطالعے پر مبنی ہے۔

یہ کتاب صرف بجنور کے مشہور اخبار ''مدینہ'' کی تاریخ ہی نہیں بیان کرتی بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی مسلمانوں کا جو اجتماعی شعور، سیاسی بیداری اور عالمگیر اسلامی تخیل ابھرا، اس کی جڑیں دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ یا لاہور جیسے بڑے شہروں سے زیادہ چھوٹے چھوٹے قصبوں کے پرنٹنگ پریسوں میں پیوست تھیں، جس میں بجنور، مئو، اعظم گڑھ، گیا اور پٹنہ وغیرہ شامل ہیں۔

یہ کتاب اس مفروضے کو چیلنج کرتی ہے کہ جدید مسلم سیاسی شعور اور عوامی بحث صرف بڑے شہروں اور اشرافیہ کے ہاتھوں تشکیل پاتی رہی۔ بلکہ وہ ثابت کرتی ہیں کہ قصباتی اشرافیہ نے، اپنی جغرافیائی تنہائی اور تاریخی تسلسل کی بدولت، ایک ایسا بیانیہ تخلیق کیا جو نہ صرف مقامی تھا بلکہ عالمگیر بھی تھا، اس کی جڑیں ماضی میں بھی پیوست تھیں اور وہ مستقبل کی طرف بھی دیکھتا تھا۔

مصنفہ کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ اردو عوام کو سمجھنے کے لیے ہمیں جغرافیائی مرکزیت کے روایتی تصور سے نکلنا ہوگا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اصل طاقت حاشیے پر تھی۔ ایک دورافتادہ قصبے

سے نکلنے والا اخبار پورے شمالی ہند اور پنجاب میں کیوں اتنا مقبول ہوا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے میگن روب نے نہ صرف ایک شاندار تاریخی تحقیق پیش کی ہے بلکہ ایک نیا نظریاتی ڈھانچہ بھی تخلیق کیا ہے جسے وہ "ٹائم اسکیپ" یعنی وقت اور جگہ کے باہمی تعلق کا نام دیتی ہیں۔

کتاب کا آغاز ایک دلچسپ کہانی سے ہوتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں بجنور کے ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھنے والے محمد مجید حسن نے اپنی بیوی کے زیور فروخت کر کے "مدینہ" اخبار کی بنیاد رکھی۔ وہ نہ کسی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، نہ علی گڑھ یا دیوبند جیسے نامی گرامی اداروں سے فارغ التحصیل تھے، لیکن اس کے باوجود چند ہی برسوں میں ان کا اخبار شمالی ہند اور پنجاب کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اخبار ایک دن شمالی ہند کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اردو اخبار بن جائے گا، یہاں تک کہ لاہور، دہلی اور لکھنؤ کے قارئین بھی اس کا انتظار کریں گے۔ مدینہ کی یہ غیر معمولی کامیابی اس بات کی علامت تھی کہ سامراجی ہندوستان میں عوامی سمجھ اب صرف بڑے شہروں تک محدود نہیں تھی بلکہ قصبوں اور دیہاتوں تک بھی پھیل چکی تھی۔ میگن روب اسی رجحان کو اپنا موضوع بناتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ قصباتی پرنٹ میڈیا نے کیسے قومی اور عالمی سیاست کو صوبائی بنایا اور صوبائی مسائل کو قومی و بین الاقوامی سطح پر اٹھایا۔

"مدینہ" کے مدیران میں برصغیر کے ممتاز اہل قلم شامل تھے، جن میں مولوی سید نور الحسن ذہین کرتپوری، سید محمد لائق حسین قوی "زمر درقم" امروہوی، ایم آغا رفیق بلند شہری، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا بدر الحسن جلالی، مولوی نور الرحمٰن-بی اے، محمد احسن مرادآبادی، مولانا نصر اللہ خان عزیز، حمید حسن فخر بجنوری، ایم شبیر بیگ، مولانا حامد الانصاری غازی اور ابوسعید بزمی شامل تھے؛ جبکہ دیگر اہم معاونین میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، قاضی محمد عدیل عباسی، مولانا محمد عثمان فارقلیط، مولوی شبیر الرحمٰن چاندپوری، ماہر القادری، قدوس صہبائی اور مولانا شوکت علی جیسے لوگ شامل تھے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ نام محض اُس دور کے نمایاں ادیب یا صحافی کا نہیں ہیں، بلکہ مجموعی طور پر برصغیر میں بیسویں صدی

کی فکری اور علمی اٹھان میں بھی ان کا کردار نمایاں رہا اور آج بھی ان کا اثر مسلمانوں کی فکری تاریخ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں ان سب کا مختصر اًتعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں مدینہ اخبار کی پیدائش، اس کے مالک اور مدیران کی تاریخ، اور قصباتی پس منظر میں اردو کس طرح عوامی دائرۂ کار میں آئی اور کس طرح اس کی تشکیل ہوئی، کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ یہاں بجنور کو ایک ایسا مقام قرار دیتی ہیں جو شہری اشرافیہ کے بجائے مسلم شناخت کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

مصنفہ کا سب سے اہم اور نیا تصور زمان و مکان کا ہے۔ وہ کہتی ہیں: یہ نہ صرف ایک جگہ ہے بلکہ ایک وقت بھی ہے۔ بجنور قصبہ تاریخی طور پر مغلیہ دہلی کے قریب تھا، وہاں کے اشراف اپنا نسب مغل دربار سے ملاتے تھے، مگر بیسویں صدی کے اوائل میں ریل اور سڑکوں کی کمی کے باعث وہ نسبتاً تنہا اور الگ تھلگ ہو چکا تھا۔ یہی دوہری حیثیت، ماضی کی قربت اور حال کی دوری، مدینہ کو وہ آزادی عطا کرتی تھی جو علی گڑھ، دیوبند یا لکھنؤ کے بڑے اداروں کو میسر نہ تھی۔ نتیجتاً مدینہ نہ سرکاری دباؤ میں آیا، نہ فرقہ وارانہ سیاست میں الجھا اور نہ نوابی رعنائیوں کا اسیر ہوا۔ اس نے ایک ایسی آزاد آواز پیدا کی جو اشرافیہ کی روایت کو بھی برقرار رکھتی تھی اور جدید سیاسی سوالات سے بھی براہِ راست مخاطب تھی۔

کتاب کا سب سے اہم حصہ دوسرا باب ہے، جس میں مصنفہ یہ ثابت کرتی ہیں کہ بجنور ماضی میں قید کوئی قصبہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسا مقام تھا جو وقت کو لکیری انداز میں نہیں دیکھتا تھا، بلکہ اسے گھماؤ دار، رواں اور تخلیقی زمانی منظر نامہ کے طور پر برتتا تھا۔ قصباتی لوگ خود کو دہلی کے زوال یافتہ اشراف کا وارث سمجھتے تھے، مگر ساتھ ہی جدیدیت سے خائف بھی نہیں تھے، اس لیے ان کا زمانہ ماضی، حال اور مستقبل یکساں طور پر زندہ تھا۔ یہ تصور یورپی مفکرین ہابرماس، اینڈرسن اور وارنر کے عوامی دائرے کے نظریاتی سانچے کو چیلنج کرتا ہے، جو وقت کو سیدھی لکیر میں بہتا ہوا سمجھتے ہیں، جب کہ اردو عوامی دائرہ وقت اور جگہ کو اس طرح باہم پیوست دکھاتا ہے کہ مدینہ کا قاری بجنور میں بیٹھ کر استنبول کی خلافت کے انجام پر بھی فکر مند ہوتا، دہلی کے زوال پر بھی افسردہ رہتا

اور ماضی کی جنگوں کو حال کا تسلسل بھی سمجھتا تھا۔

اس زمانی منظر نامے کی سب سے روشن مثال یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء کی بلقان جنگ کو ''صلیبی جنگ'' قرار دیا گیا، ۱۹۱۵ء کے برطانوی حملے کو ''کربلا'' سے جوڑا گیا، اور ۱۹۲۴ء کی خلافت کے خاتمے کو بغداد کے زوال کا اعادہ بتایا گیا۔ گویا بجنور کا قلم سات سو سال پرانے یروشلم اور صدیوں کے اسلامی تاریخ نامے سے براہِ راست گفتگو کر رہا تھا۔ یہی احساس مصنفہ کو اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ اردو کا اصل عوامی حلقہ بڑے شہروں میں نہیں بلکہ بجنور جیسے بظاہر غیر اہم مگر تاریخی شعور سے لبریز قصبوں میں تشکیل پایا، جہاں نہ ریلوے تھی نہ عظیم ادارے، مگر تاریخ ہی اصل طاقت تھی؛ اور اسی نے اس چھوٹے قصبے کو وہ آواز عطا کی جو بیسویں صدی کے مسلم ہندوستان کی فکری دھڑکن بن گئی۔

کتاب کا تیسرا باب شاید سب سے دلچسپ ہے جہاں مصنفہ ''اردو لیتھوگرافی'' کو ایک ''مسلم ٹیکنالوجی'' قرار دیتی ہیں۔ عام طور پر ہم پرنٹنگ کو ایک غیر جانبدار تکنیک سمجھتے ہیں، مگر میگن روب دکھاتی ہیں کہ لیتھوگرافی اردو والوں، خصوصاً مسلمانوں کے لیے محض چھپائی کا طریقہ نہیں بلکہ ایک ثقافتی وسیاسی عمل بھی تھا۔ چونکہ لیتھوگرافی کی بدولت نستعلیق خط اپنی پوری خوبصورتی اور روانی کے ساتھ چھپ سکتا تھا، اس لیے اسے اسلامی خطاطی کی حفاظت کا ذریعہ سمجھا گیا۔ مدینہ نے اس تکنیک کو اس قدر کمال تک پہنچایا کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں وہ شمالی ہند کا سب سے خوبصورت چھپنے والا اخبار مانا جاتا تھا۔ یہ خوبصورتی محض جمالیاتی نہ تھی بلکہ شناختی بھی تھی؛ یہ اشرافیہ کی پہچان، تہذیب اور مزاج کی عکاس تھی۔ یہاں مصنفہ مادّی تاریخ کے ذریعے یہ ثابت کرتی ہیں کہ ٹیکنالوجی کبھی غیر جانبدار نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ کسی شناخت کی حامل ہوتی ہے۔

چوتھا باب بلقان جنگوں سے خلافت تحریک تک کے سفر کا احاطہ کرتا ہے اور دکھاتا ہے کہ ایک قصباتی اخبار نے کیسے ہندوستانی مسلمانوں کو عالمگیر امّت کا حصہ بنایا۔ ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء کی بلقان جنگوں کے دوران مدینہ نے ترکی کی شکست کو ''اسلامی سانحے'' کے طور پر پیش کیا اور بجنور جیسے چھوٹے شہر میں بھی خلافت کے لیے لاکھوں روپے اکٹھے ہوئے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی بلکہ اس

کی جڑیں ”مدینہ“ کی ان مسلسل کوششوں میں تھیں جن کے ذریعے وہ اپنے قارئین کو یورپ کے نقشے کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا سکھا رہا تھا۔ اسی دور میں ہندوستانی مسلمان پہلی بار خود کو ترکی، ایران، عرب دنیا اور وسطی ایشیا کے ساتھ ایک وحدت کے طور پر محسوس کرنے لگے تھے۔ ”مدینہ“ نے اس شعور کو قصباتی سطح پر اس قدر گہرا کیا کہ تحریک خلافت محض اشرافیہ کی شہری سیاست نہ رہی بلکہ دیہاتوں اور قصبوں تک جا پہنچی۔

کتاب کا سب سے حیران کن انکشاف ۱۹۳۷ء کے بعد کا ہے۔ جب مسلم لیگ تیزی سے ابھر رہی تھی اور پاکستان کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ ”مدینہ“ نے مسلم لیگ کی سخت مخالفت کی۔ اس نے نہ صرف قراردادِ لاہور (۱۹۴۰ء) کو مسترد کیا بلکہ پاکستان کے مطالبے کو ”اشرافیہ کی سازش“ قرار دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حسین احمد مدنی اور کانگریسی مسلمانوں کی مسلسل حمایت کی۔ یہ موقف علی گڑھ، لاہور اور دہلی کے بڑے اخبارات سے یکسر مختلف تھا۔ میگن روب یہاں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں تمام مسلمان پاکستان کے حق میں نہیں تھے بلکہ ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جو متحدہ ہندوستان میں رہنا چاہتی تھی اور وہ قصباتی اشرافیہ کی نمائندگی کرتی تھی۔ ”مدینہ“ اسی متبادل آواز کا سب سے بڑا ترجمان تھا۔

مصنفہ کی سب سے بڑی نظریاتی شراکت ”زمانی منظرنامہ“ کا تصور ہے، جسے وہ کتاب کے آخری باب میں تفصیل سے واضح کرتی ہیں۔ ان کے بقول اردو عوام کو سمجھنے کے لیے وقت کی تین تہوں کو یکجا طور پر دیکھا جانا چاہیے: ماضی، جس میں مغلیہ دہلی سے تاریخی قربت جھلکتی ہے؛ حال، جو استعماری دور کی جغرافیائی تنہائی کی عکاس ہے؛ اور مستقبل، جس میں آزادی اور ممکنہ تقسیم کے خواب پوشیدہ ہیں۔ مدینہ نے ان تینوں ادوار کو ملا کر ایک نیا اسلامی، قصباتی زمانی منظرنامہ تخلیق کیا، جو نہ مکمل طور پر نوآبادیاتی تھا، نہ قوم پرستانہ، اور نہ ہی فرقہ وارانہ۔ یہ ایک ایسا فکری و ثقافتی ڈھانچہ تھا جو روایت کو محفوظ رکھتا اور جدید دنیا کے ساتھ ہم آہنگ بھی رہتا، یعنی ایک ایسی شناخت جو ماضی کی رگوں سے جڑی اور مستقبل کے افق سے بھی ہم آواز تھی، جس نے اردو عوام کی تاریخی، سماجی اور تہذیبی جہتوں کو یکجا کر کے ایک نیا فکری منظر فراہم کیا تھا۔

کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنفہ نے مدینہ کے تقریباً ہر شمارے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور نایاب مواد اکٹھا کرنے کے لیے برٹش لائبریری، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا،

اترپردیش اسٹیٹ آرکائیوز، رضا لائبریری رامپور اور بجنور کے نجی مجموعوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ کتاب کی دوسری نمایاں خوبی یہ ہے کہ مصنفہ نے لیتھوگرافی اور طباعت کی ماڈی تاریخ پر نہایت شاندار اور مفصل بحث پیش کی ہے، جس سے پرنٹ کے فنی، ثقافتی اور تاریخی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ قصبے کو صرف زوال یافتہ اشرافیہ کی یادوں سے معمور مرکز کے طور پر نہیں دکھایا گیا بلکہ اسے ایک فعال سیاسی و فکری مقام عبرت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چوتھی اور سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی دولخت تقسیم سے بالاتر ہو کر ایک تیسری، قصباتی، غیر فرقہ وارانہ، مسلم اشرافیہ کی آواز کو اجاگر کیا گیا ہے، جو نہ صرف تاریخی حقائق کو نمایاں کرتی ہے بلکہ اردو عوام کی پیچیدہ سماجی و ثقافتی جہتوں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

کتاب کے مطالعے کے دوران کچھ تنقیدی سوالات بھی ابھرتے ہیں۔ مثال کے طور پر: مدینہ کے دیوبند، ندوۃ العلماء، فرنگی محل یا احمدیہ سے تعلقات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیا واقعی مدینہ اتنا آزاد تھا جتنا مصنفہ دعویٰ کرتی ہیں؟ اس کے علاوہ، کتاب میں خواتین کے کردار تقریباً غائب ہیں۔ کیا قصباتی عوامی دائرہ صرف مردوں تک محدود تھا؟ تیسرا، ۱۹۴۷ء کے بعد مدینہ کی تاریخ پر صرف چند سطریں پیش کی گئی ہیں۔ کیا جان بوجھ کر کیا گیا ہے؟ اور چوتھا، بعض اوقات "زمانی منظر نامہ" کا تصور اتنا تجریدی ہو جاتا ہے کہ عام قاری کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بہر حال، یہ چند سوالات کتاب کی عظمت اور اہمیت کو کم نہیں کرتے۔ کتاب بیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، فکری اور ثقافتی تاریخ کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ تحریک خلافت، مسلم شناخت کی تشکیل، پاکستان کی مخالفت، اور اردو طباعت کی جمالیات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے قصبات کی جانب نگاہ ڈالنا لازم ہے، اور مدینہ جیسے اخباروں نے بخوبی یہ ثابت کیا کہ دراصل حاشیہ ہی اکثر مرکز کا کردار ادا کرتا ہے۔

یہ کتاب ہر اس طالب علم، محقق اور قاری کو پڑھنی چاہیے جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ جدید ہندوستانی مسلمان کس طرح وجود میں آئے، ان کی آواز کہاں سے اٹھی اور وہ کس طرح اپنی روایت اور جدیدیت کے درمیان الجھے رہے۔ اردو میں اس کا فوری ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ اردو والے اس عمدہ کتاب سے براہِ راست فیض یاب ہو سکیں۔

دوحہ عربی تاریخی ڈکشنری کا اجراء

قطر کی راجدھانی دوحہ میں ۲۲؍دسمبر ۲۰۲۵ کو امیر قطر شیخ تمیم آل ثانی کی موجودگی میں دوحہ عربی تاریخی ڈکشنری (معجم الدوحۃ التاریخی للغۃ العربیۃ) کا اجراء عمل میں آیا۔ تیرہ سال در جنوں ریسرچ اسکالرز اور ہزاروں معاونین کی محنت سے وجود میں آنے والی یہ عربی ڈکشنری آج تک تیار ہونے والی تمام عربی ڈکشنریوں سے زیادہ جامع ہے۔ یہ ڈکشنری پچھلی بیس صدیوں کے درمیان عربی الفاظ کے استعمالات، تبدیلیاں، دوسری زبانوں سے استعارہ، نئے الفاظ کب بنے یا متروک ہوئے وغیرہ کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں تین لاکھ مدخل، ۱۰؍ہزار لغوی حدود اور دس کروڑ (ایک بلین) مشتقات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈکشنری کے مآخذ کی لسٹ دس ہزار کتابوں اور مصادر پر مشتمل ہے جس کی بنا پر یہ عربی زبان کی اب تک کی وسیع ترین ڈکشنری ہے۔

اس ڈکشنری کا کام ۲۰۱۳ء میں شروع ہوا تھا۔ اس میں پچھلی بیس صدیوں سے عصر حاضر تک وجود میں آنے والے عربی الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسری عربی ڈکشنریوں کے برعکس یہ ڈکشنری تاریخی طور پر عربی الفاظ کے ظہور کا احاطہ کرتی ہے، جو الفاظ متروک ہو گئے ہیں، ان کی تحدید بھی کرتی ہے، عربی میں داخل ہونے والے عجمی کلمات کی بھی وضاحت کرتی ہے اور عربی الفاظ کے دوسری سامی زبانوں سے تعلق کو بھی واضح کرتی ہے۔ اس ڈکشنری سے اس ویب سائٹ پر استفادہ کیا جاسکتا ہے:

https://www.dohadictionary.org

(الجزیرہ، ۲۲؍دسمبر ۲۰۲۵ – تلخیص وترجمہ: ظفر الاسلام خان)

باب التقریظ والانتقاد

گیان چند جین کے خطوط مشاہیر ادب کے نام

(جلد اول تا سوم)

مرتبہ:ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا

کلیم صفات اصلاحی

جلد اول: مجلد، صفحات ۶۳۴، سن اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۷۵۰روپے۔ جلد دوم: مجلد، صفحات ۵۴۴، سن اشاعت:۲۰۲۵ء، قیمت:۷۵۰روپے۔ جلد سوم: مجلد، صفحات ۵۳۴، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت:۴۰۰روپے۔ ملنے کا پتہ:شاردا کٹیر، f-237،لوئر ہری سنگھ نگر، رہاڑی کالونی، جموّں (جے اینڈ کے، یو-ٹی)۱۸۰۰۰۵، موبائل نمبر:9419828542۔

پروفیسر گیان چند جین اردو کے صف اول کے محققین اور ماہرین لسانیات میں ہیں۔انہوں نے اردو زبان وادب کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے۔ استاد کی حیثیت سے نیک نامی ان کے حصے میں آئی۔انہوں نے کلاسیکل ادب،شاعری اور اردو نثر کے گیسو سنوارے اور مختلف ادبی رجحانات، اردو تحقیق وتنقید اور لسانیات کے جدید مسائل ومباحث کا تجزیہ کیا۔ان کی بیشتر کتابیں اردو کی نثری داستانیں، لسانی مطالعے وتجزیے، تحقیق کا فن، تاریخ ادب اردو اور اردو کا اپنا عروض وغیرہ اردو کے تنقیدی ذخیرے میں اضافہ ہیں۔ان کے تحقیقی اور ادبی کاموں میں کسی کو ثانوی حیثیت دینا بہت مشکل ہے۔ اردو کی خدمت کے صلے میں انہیں جو عزت وشہرت اور وقار ومقام حاصل ہوا وہ قابل رشک ہے۔ادبی تحقیق کی دنیا میں وہ جس منصب پر فائز تھے وہاں تک پہنچنے میں ان کی محنت شاقہ، قوت مشاہدہ، یکسوئی اور دلجمعی جیسے عوامل کا بڑا دخل تھا۔ان کی علمی شخصیت کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کے مطالعے نے ان میں سماجی شعور پیدا کیا۔ کٹر مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود ان کو مذہب سے بہت مناسبت نہیں تھی۔ لیکن ان کے بقول ان کی بیزاری ونامناسبت الحاد کے بجائے تشکیک کے حصار میں قید تھی۔اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی فکر میں مذہب ہی کو اعلیٰ اخلاق کا سب سے بڑا پشت پناہ سمجھتے تھے۔اسی کے ساتھ وہ توہم پرست بھی تھے اور بعض خطوط سے تو ان کی توہم پرستی عام

اوران پڑھ لوگوں سے بھی بڑھ کر نظر آتی ہے۔ وہ جمالیات کے متلاشی تھے۔ ان کے مطابق جو چیز جتنی خوشنما ہوتی ہے اتنی ہی ان کو پسند آتی ہے۔ حسن فطرت ہو کہ حسن خصلت کہ حسن انسان، بس جین صاحب اس کے گرویدہ ہو جاتے۔ زیر نظر مجموعے کی تیسری جلد میں شامل ان کی آپ بیتی میں اس کے واضح اشارے موجو ہیں۔

مدۃ العمر اردو سے لو لگانے کے باوجود ان کی آخری تصنیف "ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب" اردو والوں کے درمیان متنازع اور اردو سے ان کی بے بنیاد نفرت کا وسیلہ بن گئی اور اس سے بہت سے دلوں میں ان کی عظمت کی جو ساکھ قائم تھی اس کو سخت نقصان پہنچا اور اس کے ردّ و مخالفت میں مضامین لکھے گئے۔ اس سے اردو اور مسلمانوں کے تئیں ان کے جو خیالات و نظریات دنیا کے سامنے آئے وہ ان متعصب، نسلاً خود کو بڑا سمجھنے والے، نام نہاد انٹلکچول اور فرقہ پرستوں کے ہوتے ہیں جن کی فریق مخالف سے باہم فکری عداوت اور مسلسل کشاکش ہوتی ہے۔ کسی علمی وادبی مسئلے میں اختلاف رائے سے قطع نظر غیر مذہب ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ بغض و عناد یا ان کو نظر انداز کیے جانے کا مسلمان ادباء کی طرف سے بہ ظاہر کوئی اجتماعی معاملہ بھی نہیں ہے، اس لیے ان کے اس احساس کو بے بنیاد ہی کہا جائے گا۔

زیر نظر جلدیں اردو کے اسی عظیم مصنّف کے خطوط کا مجموعہ ہیں جن سے نہ صرف علمی، لسانی اور تحقیقی امور کے بیش بہا پہلو سامنے آئے ہیں بلکہ ان سے گیان چند جین صاحب کے مزاج و شخصیت کی وہ جہات بھی وا ہوئی ہیں جو علمی وادبی کتابوں میں نظر نہیں آتیں۔

اس سے پہلے پروفیسر گیان چند کے خطوط کے دو مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ایک پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام ۳۰ خطوط پر مشتمل "گیان نامے" اور دوسرا مرزا خلیل احمد بیگ کے نام ۶۳ خطوط پر مشتمل مجموعہ۔ مگر ان مجموعوں کی نوعیت انفرادی ہے۔ اس لیے ان کی اشاعت وطباعت کا مرحلہ بہت مشکل نہیں تھا۔

لیکن زیر نظر مجموعہ ہائے مکاتیب کی نوعیت اور حیثیت ان سے الگ اوران کی جمع و ترتیب زیادہ دقت طلب ہے۔ یہ تینوں ضخیم مجموعے ملک کی تقریباً سات درجن ذی علم ہستیوں کے نام ان کے خطوط پر مشتمل ہیں۔ خوشی ہے کہ یہ ایک ایسے نامور اہل قلم کے مرتب کردہ ہیں جن کی علمی وادبی حلقوں میں سنجیدہ شناخت قائم ہے۔ فاضل مرتب کو گیان چند جین صاحب سے ملاقات

و نیاز بھی حاصل رہا ہے۔ مکاتیب کی جمع و ترتیب اور اہتمام سے ان کی اشاعت کا انہیں دیرینہ تجربہ بھی رہا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے رشید حسن خان کے خطوط تین جلدوں میں مرتب کر کے ہندوپاک دونوں ملکوں سے شائع کرائے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ ہائے خطوط کی جمع و ترتیب اور ان کو منظر عام پر لانے کے پیچھے ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کی تحریک سب سے اہم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان ہی کے ایما، حوصلہ افزائی اور سرگرم تعاون سے یہ اہم علمی خدمت پایۂ تکمیل کو پہنچی اور عام استفادے کے لیے پیش ہو سکی۔

پیش لفظ کے بعد مرتب نے تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل جین صاحب کے شجرہ نسب، سوانحی کوائف، مذہب، املا، اندرون اور بیرون ملک اسفار اور امریکہ نقل مکانی اور انتقال کے متعلق تفصیلات پیش کی ہیں اور خطوط کی روشنی میں جین صاحب کی شخصیت کا گہرا مطالعہ بھی پیش کیا ہے بالخصوص جین صاحب کے املا سے سے متعلق نظریات و افکار اور ان کے علمی و ادبی اسفار کا احاطہ بڑی باریک بینی اور تفصیل سے کیا ہے۔ خطوط کی ترتیب یوں تو تاریخی ہے یعنی ہر مکتوب نگار کے جتنے خطوط ہیں ان میں تاریخ و سن کا لحاظ کیا گیا ہے لیکن مکتوب نگاروں کی ترتیب میں علمی و ادبی مرتبہ کے بجائے ہجائی ترتیب پیش نظر رکھی گئی ہے جو بعض لحاظ سے بہت مناسب ہے۔ مرتب نے فہرست ہی میں خطوط کی تعداد دے کر یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ مکتوب نگار نے کس کو کتنے خطوط لکھے ہیں۔

جلد اول : اس جلد میں ۲۲ مکتوب الیہم کے نام ۴۵۹ خطوط ہیں۔ سب سے پہلا خط ۲۶، مئی ۱۹۵۶ء اور آخری ۵، جولائی ۲۰۰۵ء کا مرقومہ ہے۔ جن ۲۲ علمی و ادبی اشخاص کے نام خطوط ہیں ان کی فہرست یہاں اس مقصد سے نقل کی جاتی ہے کہ قاری بالخصوص محققین کو سر دست یہ معلوم ہو جائے کہ اس جلد میں کن اصحاب علم و تحقیق کے نام خطوط ہیں۔ اس میں آل احمد سرور، آمنہ خاتون، آنند نرائن ملا، ابو محمد سحر، ابو الکلام قاسمی، اسد اللہ وانی، اطہر فاروقی، اکبر حیدری، بیدار بخت، پریم پال آسیب، تاراچرن رستوگی، جی، کے، مانک ٹالا، جگن ناتھ آزاد، جمیل الدین عالی، حبیب الرحمن، حمیدہ سلطان، حنیف نقوی (شاگرد گیان چند) خلیق انجم، راج بہادر گوڑ، راہی فدائی، رشید حسن خان، رفیع الدین ہاشمی کے نام خطوط ہیں۔ سب سے زیادہ خطوط اس جلد میں خلیق انجم کے نام (۱۱۶) اس کے بعد ابو محمد سحر (۱۰۶) اور اس کے بعد آل احمد سرور کے نام (۱۰۳) مکاتیب ہیں۔

جلد دوم: اس جلد میں ۳۹ / اشخاص کے نام ۴۲۲ خطوط ہیں جن میں وہ چار اہل قلم جگن ناتھ آزاد، پروفیسر حنیف نقوی، خلیق انجم اور راہی فدائی بھی ہیں جن کے نام جلد اول میں بھی خطوط ہیں۔ مرتب نے مکتوب الیہم کی ترتیب ہجائی رکھی ہے اور پہلی جلد حرف "ر" پر ختم ہوئی ہے۔ چونکہ جلد دوم اور سوم اس کے ایک سال بعد منظر عام پر آئی تو ہجائی ترتیب کا آغاز جلد دوم میں پھر سے الف سے کیا گیا اور اس درمیان خطوط کی حصولیابی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس جلد میں درج ذیل افراد کے نام خطوط ہیں:

اصغر عباس، چغانی، حمید الدین شاہد، راج کمار چندن، سرور تونسوی، سری نواس لاہوٹی، شاہد اقبال، شباب ایاز، شرف الدین ساحل، شمس الحسن کنول، شمس بدایونی، شمیم جہاں، شیام لال کالڑا عابد پیشاوری، صالحہ عابد حسین، ظفر ادیب، ظہور الدین، ظہیر احمد صدیقی، عابد رضا بیدار، عارف نوشاہی، عبد المغنی، عبد الودود، عبد الوہاب، عشرت ظفر، عقیل رضوی، علیم صبانویدی، عنوان چشتی، غلام رضوی گردش، فضل اللہ مکرم، قمر الہدی فریدی، کرامت علی کرامت، کرشنا موہن، کوثر صدیقی، کیلاش مہر اور گوپی چند نارنگ۔ اس جلد میں جن تین اشخاص کے نام سب سے زیادہ خطوط ہیں ان میں ڈاکٹر سید عقیل رضوی کے نام (۱۱۲) پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام (۹۰) اور پروفیسر شیام لال کالڑا عابد پیشاوری کے نام (۵۴) خطوط ہیں۔

جلد سوم: میں ۱۹ اشخاص کے نام کل ۳۹۶ خطوط ہیں۔ آخر میں گیان چند جین صاحب کی پانچ دلچسپ تحریریں: ایک ادبی کچہری میں سماعت، قاضی عبد الودود : ایک تحقیقی مطالعہ، قاضی عبد الودود پر میری کتابیں، محمد نسیم الدین فریس کی تحقیقات اور گیان چند کی آپ بیتی کے عنوان سے ضمیمے کے طور پر شامل ہیں۔ مرتب کے بقول ان میں سے تین کا تعلق خطوط نما سے ہے جو خطوط کے ساتھ مدیران کو بھیجی گئی تھیں اور ایک جین صاحب کی آخری کتاب "قاضی عبد الودود-ایک مطالعہ" سے متعلق ہے (جلد ا ص ۸)۔ اس کتاب کے سلسلے میں مرتب کا یہ اظہار افسوس بھی ذکر کے قابل ہے کہ "یہ کتاب نہ تو پاکستان سے شائع ہوئی اور نہ ہی ہندوستان سے۔ نہ جانے ان مسودوں کا کیا ہوا؟"۔ مکتوب الیہم کے نام درج ذیل ہیں: گوہر نوشاہی، لئیق خدیجہ، مجاہد حسین حسینی، محبوب علی خاں اخگر، محمد حسن، محمد حسنین، محمد علی اثر، محمد مسعود، مختار الدین احمد، مسعود حسن خان، مسعود حسین خان، مسعود حسین رضوی ادیب، مظفر حنفی، معین الدین شاہین

اجمیری، مکتبہ جامعہ، ناصر الدین انصار، نثار احمد فاروقی، نئی شناخت، یو.بی اور سریو استو فگار۔ اس جلد میں سب سے زیادہ جن تین اشخاص کے نام خطوط ہیں ان میں پروفیسر مختار الدین احمد کے نام (۱۰۸) پروفیسر نثار احمد فاروقی کے نام (۹۳) اور محمد حسن کے نام (۵۵) خطوط ہیں۔

جین صاحب کا علمی سفر بڑا طویل ہے۔ برصغیر پاک وہند کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی بلاشبہہ ان کے عقیدت کیش ضرور ہوں گے جن سے رابطہ کرکے ان کے تمام خطوط حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ یہ انتہائی وقت ودقت طلب کام ہے۔ امکان کی حد تک جو خطوط حاصل کرکے اہل علم کے لیے پیش کیے گئے ہیں وہ مرتب کی جان کاہی اور ان کے عزم بالجزم کی دلیل ہیں۔

نجی اور ذاتی نوعیت کے خطوط ہر شخص کے لیے قابل توجہ اور افادیت کا سبب نہیں ہوسکتے۔ تاہم جین صاحب کے اس قسم کے خطوط کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں بھی علمی وادبی جھلک موجود ہے۔ جین صاحب خالص علمی آدمی تھے، اس لیے ان کے خطوط پر علمی رنگ غالب ہے۔ کسی میں کسی اہم کتاب، رسالہ یا علمی شخصیت سے متعلق استفسار پر توضیح ہے تو کسی میں لسانی مسئلے پر گفتگو، کسی میں علمی، تعلیمی، ادبی، شعری ونثری مسائل پر اپنی بے باکانہ رائے کا اظہار ہے تو کسی میں خود اپنے کسی علمی و تحقیقی مسئلے میں مکتوب الیہ سے استفسار۔ ان خطوط میں اردو کے ادیبوں، شاعروں، علمی کانفرنسوں، انجمن ترقی اردو ہند کی سرگرمیوں کے متعلق بہت سی کام کی باتیں ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جین صاحب اردو زبان وادب کے متعلق قدیم وجدید خیالات اور افکار ورجحانات پر نظر رکھتے تھے۔ پرانی تہذیب کے قدرداں اور نئے دور کی ضروریات اور تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ رشید حسن خاں خود ایک بڑے اہل قلم اور محقق ہیں۔ ان کے حوصلوں کو جین صاحب نے کس طرح مہمیز کیا ہے۔ ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”انتخاب ناسخ کے مقدمے میں آپ نے پہلے بھی اپنی تنقیدی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر آپ کے تنقیدی مضامین کافی ہوگئے ہوں تو ان کا ایک مجموعہ چھاپ دیجئے تاکہ آپ کی علمی شخصیت کا یہ رخ بھی سب کے سامنے آجائے“ (ج ا ص ۵۹۲)۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے معارف میں ان پر لکھا تھا کہ وہ ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جن کی زندگی ہی میں ان پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے مگر خود جین صاحب ڈاکٹر خلیق انجم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”اختر الزماں (مبارکپوری) نے خواہ مخواہ مجھ پر تحقیق کا موضوع لیا۔ ابھی میں مزید کام کرنے کی خواہش رکھتا ہوں“ لیکن اسی کے بعد یہ بھی لکھا کہ ”اگر وہ دلی میں ہوں اور میرے نام کے موصولہ خطوط دیکھنا چاہیں تو سارے خطوط دکھا

دیجیے" (ج ا ص ۴۹۴)۔

جین صاحب علمی اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ اگر کسی نے ان کا علمی تعاون کیا تو اس کا کھل کر اعتراف کرتے تھے۔ خطوط بالعموم انسان کی ذاتی، سماجی اور سیاسی زندگی کا آئینہ بھی ہوتے ہیں لیکن جین صاحب کے ان خطوط میں علم و ادب، تحقیق و تنقید، فکر و شعور، زبان و بیان کا پہلو ایسا ابھرا ہوا ہے کہ ان کے دور میں بر صغیر پاک و ہند سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے دوچار تھا لیکن ان کے خطوط میں اس زمانے کی سیاسی و سماجی اور انقلابی اتھل پتھل کے مناظر کم ہی نظر آتے ہیں۔ ان خطوط کا ایک پہلو احباب و معاصرین سے تعلقات میں تدریجی رفتار میں تبدیلی بھی ہے جس کے نتیجے میں ان کا لب و لہجہ بدلا بدلا محسوس ہوتا ہے۔ یعنی مرور وقت کے ساتھ جامعیت و پختگی میں کمال نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر اور زبان و بیان کا نمایاں وصف ان کا حشو و زواید سے پاک ہونا ہے۔ حالانکہ خطوط میں اس کی گنجائش سنجیدہ علمی تحریروں کے بالمقابل زیادہ ہوتی ہے۔ خطوط میں القاب و آداب اور تمہید کا التزام ایک زمانے تک رہا لیکن جین صاحب مجبی، مکرمی، عزیزی اور محب مکرم اور اسی قسم کے رسمی الفاظ سے آگے نہیں بڑھتے تھے اور علامہ شبلی کی طرح اکثر بلا تمہید مطلب پر آجاتے ہیں۔ گویا وہ اس روایت شکنی کے بجا طور پر زبردست مؤید و حامی تھے۔

گیان چند جین اردو کو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار سمجھتے تھے اور کسی خاص فرقے کی اجارہ داری غلط خیال کرتے تھے۔ بعض مسلمانوں کو اردو کے فروغ و ترقی کے متعلق حکومتوں کی متعصبانہ پالیسیوں کی وجہ سے بعد میں اس خیال سے اختلاف ہو گیا تھا۔ تاہم بعد میں انہوں نے اردو کی بقا اور اس کے حقوق کے تحفظ کو مسلمانوں کی ذمہ داری سے جوڑ دیا تھا۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اس قسم کے اختلافی مسائل میں کھل کر رائے زنی کی ہے اور اعتدال کی راہ اپنانے کے بجائے اپنے موقف پر اصرار بھی کیا ہے۔ اپنے ایک مکتوب الیہ کو اپنی نجی رائے لکھتے ہیں کہ "اردو ادب کے مطالعے اور اردو کے مسلمان ادیبوں کے اقوال کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار نہیں بلکہ مسلم اقتدار اور علاحدگی پسندی کی پیداوار ہے...... میں جان پر کھیل کر سوڈیڑھ سو صفحوں کا ایک کتابچہ لکھنا چاہتا ہوں"...... اسی میں آگے لکھتے ہیں "میرا احساس ہے کہ اردو میں ہندو صرف اسی طرح جی سکتا ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کی خوشنودی پر نظر رکھے۔ ایسا کچھ نہ کہے جس سے وہ ناراض ہوں" (ج ا، ص ۴۰۴)۔ جین صاحب کے ان تاثرات سے شاذ ہی لوگ اتفاق کریں گے۔ بہر حال یہ علمی تحفہ مکتوباتی ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہے۔

تبصرۂ کتب

علیزے نجف، کیا ہم زندہ ہیں: متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات: ۲۴۰، قیمت: ۳۹۹ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، یوپی اور لکھنؤ، دہلی، اورنگ آباد اور حیدر آباد کے معروف مکتبے، ای میل: alizey.najaf@gmail.com

اس الگ قسم کی کتاب کی مصنفہ کی شناخت بھی اردو کی تحریری دنیا میں کچھ الگ ہی سی ہے اور یہ نامور اور کارگزار شخصیتوں سے کی گئی ان کی باتوں اور سوالوں سے سمجھ میں بھی آتی ہے۔ ایک الگ سوچ، دل کی الگ حساسیت اور آنکھوں میں پوشیدہ ایک الگ بصیرت والی بصارت نے ان کے قلم کو بھی ایک جدا پہچان دے رکھی ہے۔ جو اس قسم کے سوالات کے ہیولے بنانے سے گریز نہیں کرتا کہ ہم حرام موت مرنے سے ڈرتے ہیں / لیکن اپنی روحوں کی حرمت و تقدس کی / ہر روز پامالی پر / ہمیں کوئی دکھ نہیں ہوتا / ہمیں ان لاشوں پہ رونے کی فرصت نہیں / جنہیں ہم ہر روز چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ خیالات کی یہی ندرت اور انفرادیت ہے جو مقصد سے بے نیاز زندگی کی اس سطحیت پر نظر ڈالتی ہے جس کی وجہ سے خود سے اس تعلق کے ٹوٹنے کا احساس ہوتا ہے جو بامعنی ہوتا ہی نہیں اور پھر اندرون سے آواز اٹھتی ہے کہ بیرونی پیکر میں مقصد ضرور رکھا جائے کہ توازن اسی سے برقرار رہتا ہے۔ جسمانی وجود، روحانی اور جذباتی وجود کے بغیر ادھورا ہے۔ ان تینوں کی تربیت ہی سے اس سوال کا جواب مل سکتا ہے کہ کیا ہم زندہ ہیں؟

کتاب میں اسی بنیادی سوال نے جو پہلو تلاش کیے، وہ قدیم ہوتے ہوئے بھی جدید جوابوں کی دنیا تلاش کرنے میں لکھنے والے کے ساتھ پڑھنے والوں کو کسی بھی لمحہ خود سے بیگانہ یا بیزار نہیں ہونے دیتے۔ مسائل حل کرنے والا ذہن، نرگسیت کی وبا، ناکامی کی ذمہ داری، سوچنا ایک آرٹ ہے، عادت کی طاقت، کمفرٹ زون کی قید، مواقع ختم نہیں ہوتے، اوور تھنکنگ کے مضر اثرات، ذہنی غربت، روحانی ذہانت، شکر گزار ہونا ناگزیر کیوں؟ اور خوش رہنا سیکھنا پڑتا ہے جیسے عنوانات

اپنے مضمون کی جدت کے ساتھ قاری کی ضرورت بڑی خوبی اور آسانی سے بنتے جاتے ہیں اور اپنے اس مقصد میں کامیابی کا اعلان بھی کرتے جاتے ہیں کہ خود اپنی ذات سے بہتر طور پر کیسے متعارف ہوا جائے اور تعارف ہی نہیں اپنی ذات کی گہرائیوں میں کیسے اترا جائے۔ یہ خوبی ہی کتاب کے لیے کافی ہے لیکن جو نظریں بسیار خوباں یا خوبیاں دیکھنے کا شوق رکھتی ہیں وہ ٹاکسک پازیٹوٹی میں بھی مصنفہ کے خیالات کا سرچشمہ قرآن حکیم میں دیکھ لیتی ہیں اور وہ یہی ہے کہ قرآن حکیم انسان کو ہر منفی سوچ اور عمل سے روکتا ہے، روکتا ہی نہیں، مثبت رویہ اپنانے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ یہیں نفسیات کا علم بھی اپنی اہمیت کا احساس دلانے لگتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اسی خوبی کی نشان دہی کی کہ اس کتاب میں انسانی نفسیات کی گہرائی و گیرائی کا الگ الگ نقطۂ نظر سے ایک محیط مطالعہ سامنے آجاتا ہے۔

کتاب میں نفسیاتی صحت کو مرکزی توجہ دی گئی ہے کہ جو نفسیاتی صحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے وہ اپنی خوشیوں بلکہ خاندان اور قریبی رشتوں کی خوشیوں سے محروم ہو کر غلط رویوں کا شکار بآسانی بن جاتے ہیں۔ مصنفہ کا عندیہ اسی سے ظاہر ہے کہ وہ نفسیاتی بیماریوں کا احاطہ کرنا نہیں چاہتیں بلکہ ان بنیادی اصولوں کو سامنے لانا چاہتی ہیں جن کی مدد سے عام اور روزمرہ کی زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔ زندگی کو بہتر بنانے کی راہ میں یہ سوال شاید ضروری سمجھا گیا کہ زندہ کیوں ہیں اور صحیح معنوں میں زندہ ہیں بھی یا نہیں؟ اس جواب میں کہیں بے اعتدالی نہ ہو جائے اس لیے یہ یاد کرانا بھی ضروری سمجھا گیا کہ خود سے محبت کرنا اور خود کی خوشی پر دھیان دینا بے شک ضروری ہے لیکن اسے خود پسندی میں تبدیل نہ ہونے دینے کی ضرورت بھی بہت اہم ہے، ورنہ نرگسیت کی بیماری کے لاعلاج ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ پہلی نظر میں کتاب اس لیے اچھی لگتی ہے کہ موضوع اور مسائل پامال ہوتے ہوئے بھی زاویہ نظر کے تیکھے ہونے کی وجہ سے نئے پن کا خوشگوار احساس دلاتے جاتے ہیں۔ قاری کو اچھا لگتا ہے جب یہ الفاظ سامنے آتے ہیں کہ زندگی میں ہمیشہ بی آپشن ضرور رکھنا چاہیے، متبادل رکھنے میں لاشعوری طور پر منفی نتائج کا سامنا کرنے کی ہمت بھی ظاہر ہوتی ہے، متبادل ہوتا ہے تو خود اعتمادی بحال رہتی ہے۔

ایسی کام کی کتابیں، اردو میں کم ہی سامنے آتی ہیں، ان کو پڑھنے اور پڑھتے رہنے سے واقعی وقت کے زیاں کا احساس نہیں ہوتا۔ البتہ ضرورت سے زیادہ انگریزی الفاظ کا استعمال، اردو کی طبع نازک وخود دار کے لیے تکلیف نہیں تو گرانی کا شکوہ ضرور کرتا ہے۔ (عمیر الصدیق ندوی)

جلال الدین اسلم، نقد و نظر (منتخب مجموعہ مضامین): متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۶۴۸، قیمت: ۸۰۰روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، پتہ: اردو بک ریویو ۱۷۳۹/۱۰۴، فرسٹ فلور، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، موبائل نمبر: ۹۸۶۸۳۶۰۴۷۲

مولانا جلال الدین اسلم ان کے لیے نہایت معروف و متعارف ہیں جن کو اردو صحافت سے ذرا بھی رشتہ رہا ہے۔ کم ایسے اہل قلم یا اہل جنوں ہوتے ہیں جن کی ساری زندگی صحافت کے دشت کی سیاحی کی نذر ہوئی ہو۔ ایسے لوگ تعداد میں کم ہوسکتے ہیں لیکن جریدۂ عالم پر جاوداں نقوش ثبت کرنے میں وہ کم نہیں۔ اسلم صاحب کی صحافتی زندگی ہی ان کی اصل زندگی ٹھہری اور اس زندگی کا بھی بڑا حصہ اس اخبار قومی آواز کے لیے خاص ہوا جو ایک زمانے تک اردو صحافت کی آبرو بنا رہا۔ قومی آواز کے علاوہ اسلم صاحب کی تحریریں، دعوت، انقلاب، اخبار مشرق اور راشٹریہ سہارا جیسے اخباروں کی زینت بنتی رہیں۔ اخبار اردو اور تعمیر ہند تو ان ہی کے اخبارات تھے۔ صحافت کے لیے ایسی وقف زندگی کو ظاہر ہے خبر کے ساتھ نظر اور قلم کے ساتھ علم اور فکر کے ساتھ بصیرت کا جامع ہونا ہی تھا۔ خدا جانے انھوں نے کتنے اور کیسے کیسے مضامین، قلم کی تحویل میں دیے۔ زیر نظر ضخیم کتاب میں سینکڑوں مضامین شامل ہیں اور جو ایک بامقصد، راست باز اور امانت دار فریضے کی کامیاب ادائیگی کی جھلک بھی ہیں اور گواہ بھی۔ پہلا مضمون مولانا ابو اللیث اصلاحیؒ کے تعلق سے ہے۔ مولاناؒ کی زندگی پر جب بھی کسی تحریر کا انتخاب ہوگا تو اس میں اس کی شمولیت لازمی ہوگی۔ دوسری تحریر 'مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب، سیاسی شعور سے محروم بے بصیرت قیادت' کے عنوان سے ہے۔ صرف یہی ایک مضمون ہوتا تو اسلم صاحب کی بلند نظری اور حقیقت تک گہری رسائی کی تعریف کے لیے کافی تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت ہمیشہ رہی لیکن ہمت کم کو ہوئی کہ اس ملک کے مسلمانوں نے آزادی کے بعد اپنے تحفظ کے اس فطری تقاضے کو نہیں سمجھا اور اپنی سیاسی

بے شعوری اور عدم دوراندیشی کا ثبوت ہی پیش کرتے رہے جس کے نتیجے میں ان کی حالت اب تقسیم ملک کے وقت سے بھی بدتر ہوگئی۔ اس اجمال کی وضاحت جن الفاظ میں کی گئی ہے وہ بار بار پڑھنے اور اس سے زیادہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور اس دعا پر آمین کا لفظ بھی دل سے نکالتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بے ضمیر قیادت سے نجات دے۔

اسلم صاحب نے خطاطی کے فن کے ذریعہ الفاظ کو حسن بخشنے کے عمل سے زندگی کا آغاز کیا لیکن اس کا عروج صحافت کے فن میں الفاظ کی آراستگی و مشاطگی سے ہوا۔ اسی لیے القلم ومایسطرون کا نعرہ ان کی سانسوں میں شامل ہوگیا۔ اردو کے مشہور صحافیوں میں ان کا نام شاید تاخیر سے لیا جائے لیکن جب دیدہ ور صحافیوں کا شمار ہوگا تو یہ مجموعۂ مضامین اپنے صاحب قلم کا نام فخر سے پیش کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کرے گا۔ (ع۔ص)

حکیم مصباح الدین اظہر (مرتب)، رباب (شعری مجموعہ مع مضامین برحیات وخدمات حکیم عبدالواحد اشک بجنوری)، غیر مجلد، صفحات ۳۲۰، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: 8383096715۔

کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ سوانحی مضامین پر مشتمل ہے۔ بجنور سے تعلق رکھنے والے حکیم صاحب طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی طلبہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہیں عربی، فارسی اور اردو میں دسترس حاصل کی تھی۔ جنگ آزادی اور اس کے بعد سرگرم مقامی سیاست میں دلچسپی لی۔ صحیح تشخیص، مجوزہ نسخوں اور بعض خطرناک بیماریوں کے سستے علاج میں شہرت کے سبب دور دور سے عام اور خاص اشخاص علاج کے لیے حکیم صاحب کے آستانے پر آتے اور شفایاب ہو کر جاتے۔ اب ایسے حکماء عنقا ہو گئے ہیں۔ دوسرا حصہ ان کی دستی بیاض پر مشتمل مجموعۂ کلام "رباب" کے نام سے ہے۔ تیسرے حصے میں حکیم صاحب کی وفات پر شائع شدہ ہندی اخبار کے تراشے، ان کی بیاض سے متعدد اشعار اور ان کے نام مشہور حکیم عبداللطیف فلسفی کے ایک خط کا عکس ہے اور چوتھا حصہ مرتب کا "زندگی نامہ" کے نام سے شامل کتاب ہے۔

حکیم صاحب کو شروع ہی سے شاعری سے دلچسپی تھی۔ منشی عبداللہ صاحب عبدؔ اور منشی فضل حسین محزوںؔ (تلمیذ داغ دہلوی) سے اصلاح لی اور مہارت پیدا کی۔ سخنوری میں ان کی

استادانہ مہارت کے لیے یہ ثبوت کافی ہے کہ مشہور شاعر اور نغمہ نگار شکیل احمد بدایونی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ مرتب کے بقول انہوں نے بیاض کو کئی خانوں میں تقسیم کیا تھا۔ حمد و نعت کو "صالحات"، غزلوں کو "الہامات"، "قطعات" کو "جرعات"، نظموں کو "واردات"، رباعیات، تاریخی اشعار اور رومانی گیتوں کو "شبابات" کے خانوں میں رکھا تھا۔ انہوں نے زیادہ تر کلاسیکل شاعری کی ہے۔ سادگی، برجستگی، پختگی، شعریت اور مقصدیت ان کے کلام کے خاص اوصاف ہیں۔ غزلیں سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے بعد قطعات، پھر نظمیں اور گیت وغیرہ رباب کی زینت ہیں۔ قدرے لمبی ایک نعت اور ایک مثنوی بھی ہے۔ بنیادی طور پر اشک رومانی شاعر ہیں۔ غزلوں کا رنگ سادہ ہے مگر خیالات میں جدت، مشاہدہ کی قوت اور تجربات کی حدت نے ان کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مخفی نگاہ مہر ہے چشم عتاب میں دیکھا گیا تبسم پنہاں نقاب میں
اک لطف آرہاہے غم بے حساب میں وہ بھی جفا سے باز نہ آئیں خدا کرے
سو حشر در رکاب ہیں اک اضطراب میں میرے جنون شوق کی جولانیاں نہ پوچھ

چھوٹی چھوٹی بحر میں بڑی بڑی اور دلنشین باتیں کہہ جانا فن شاعری میں دسترس کا ثبوت ہوتا ہے۔ اشک صاحب کے کلام کی یہ خوبی بھی اکثر غزلوں میں نظر آئی۔ ان کے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ تھوڑی توجہ سے یاد ہو جائیں۔ رہروان عشق کے حوصلوں کو سادہ الفاظ اور اسلوب میں کس طرح دھار دی ہے:

کوئی حال ہو مسکراتا چلا جا محبت کا ہر غم چھپاتا چلا جا
نئی اور دنیا بساتا چلا جا ہر اک نقش دل سے مٹاتا چلا جا
غرض بزم ہستی سجاتا چلا جا محبت کے داغوں سے دل جگمگا دے

اشکؔ صاحب کی رباعیات نے بھی دامن دل کھینچا ہے۔ انہوں نے انسان کو اس کی حقیقت سے جس طرح آشنا کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

دھوکے میں خودی کے آکے مرتا کیوں ہے یوں سر کو رعونت سے تو بھرتا کیوں ہے
پھر شیر کے مانند بپھرتا کیوں ہے اک روز تری خاک پہ خر لوٹیں گے

اشک صاحب وفات پا چکے ہیں۔ انتقال کے ایک عرصہ بعد "رباب" کے نغموں کو بکھیرنے کی کوشش قابل توجہ اور یقیناً دیر آید درست آید کی مصداق ہے۔ (کلیم صفات اصلاحی)

محمد عرفات اعجاز اعظمی، مشاہیر علم وادب کا گورکھپور سے ربط و تعلق، غیر مجلد، صفحات:۲۱۶، ساجد علی میموریل کمیٹی، گورکھپور، سن اشاعت:۲۰۲۴ء، قیمت:۲۵۰روپے۔ موبائل نمبر: 9936029463۔

علمی، ادبی، اور سیاسی لحاظ سے گورکھپور کی مرکزی حیثیت واہمیت میں کوئی شک نہیں۔ وقت کے اکابر اور نام ور ہستیوں کا اس سرزمین سے ربط و تعلق اور خاص رشتہ رہا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ان مشاہیر کا جامع تذکرہ کیا گیا ہے۔ مؤلف نے اس عنوان سے ماہنامہ صدائے حرم، گورکھپور میں سلسلۂ مضامین شروع کیا اور بعد میں اس میں اضافہ کر کے اس کو ایک مفید اور عمدہ کتاب بنا دیا۔

اس کے کل چار ابواب میں پہلا باب مشاہیر علم، دوسرا مشاہیر ادب، تیسرا مختصر در مختصر اور چوتھا ضمیمہ کے نام سے ہے۔ پہلے باب میں کل آٹھ نامور فضلاء میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور اس تحریک کی آواز پر لبیک کہنے والے سید جعفر علی نقوی، محمد اسحاق، میر فیض علی اور شیخ فقیر اللہ وغیرہ کے حالات اور ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے گورکھپور کے اسفار، ان کی روحانی واصلاحی مجلسوں، ان کے مجازین صحبت میں حافظ محمد طٰہٰ اور مولانا بخشش احمد کے حالات اور خدمات کی تفصیل ہے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی کی انجمن اسلام میں شرکت کے ساتھ آخر میں اس انجمن میں شریک ہونے والوں کی ایک فہرست بھی نقل کی گئی ہے جس میں قاری طیب صاحب اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ جیسے مشاہیر امت کے نام شامل ہیں۔ مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی، مولانا شاہ وصی اللہ، مولانا قاری صدیق احمد باندوی اور آخر میں اپنے والد مولانا اعجاز احمد اعظمی مرحوم کے اس سرزمین سے تعلق اور وہاں پر ان صاحبان جبہ ودستار کی روحانی، اصلاحی، دینی کوششوں اور جلسوں کا بیان ہے۔

مشاہیر ادب میں سرسید، وسیم خیر آبادی، ریاض خیر آبادی اور منشی پریم چند کے گورکھپور سے تعلق کی نوعیت دکھائی گئی ہے۔ سرسید نے اپنے تعلیمی عزائم کی تکمیل کے لیے یوپی کے جن مشرقی اضلاع کا دورہ کیا تھا ان میں گورکھپور بھی تھا۔ انہوں نے یہاں کے مسلمانوں سے خطاب کیا

اور تعلیمی پسماندگی کے اسباب اوران کے ازالے کی تدابیر لوگوں کے سامنے رکھیں۔ مدرسۃ العلوم کے متعلق لوگوں کے شبہات اوران کے تشفی بخش جواب دیے۔ مولوی علی بخش خان اور ان کے ہم نوا مطمئن بھی ہوئے۔ سرسید نے ان کی تمام تجاویز منظور کرلیں اور خاں صاحب نے آٹھ سوروپے مدرسۃ العلوم کو دینے کا وعدہ کیا مگر بعد میں دینے سے انکار کردیا (ص ۱۳۳)۔ مختصر مختصر عنوان سے باب بڑا دلچسپ ہے۔اس کے تحت ان مشہور ہستیوں کا ذکر ہے جن کا گورکھپور سے گہرا تعلق تھا مگر ان کے باب میں تحریری شواہد برائے نام ملے۔اس ذیل میں ڈپٹی نذیر احمد، اکبر الہ آبادی، مولانا عبدالغفار عراقی، مولانا احمد حسین مبارکپوری، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، کیفی چریاکوٹی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ملک زادہ منظور احمد اور شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کے متعلق مختصر زبانی اور تحریری معلومات درج کی ہیں۔ ضمیمے میں گورکھپور سے وطنی نسبت رکھنے والے دو قدیم بزرگ شاہ احمد اللہ اور شاہ جہاں یار قادری کے تذکرے نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کردیاہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کے والد مولانا ہدایت احمد کی گورکھپور میں آمدورفت اوران کی اصلاحی و تبلیغی کوششوں کا حال بھی کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا۔سب سے آخر میں شاہی جامع مسجد کے امام قاری عبدالجلیل کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے ایک کتاب ''سنن وآداب اور حسن معاشرت'' تحریر کی تھی جس میں اس موضوع پر مختصر احادیث کی عام فہم تشریح اور موجودہ معاشرتی نظام سے اس کی تطبیق تھی۔

مصنّف کو مواد پیش کرنے کا سلیقہ ہے۔البتہ مزید تحقیق کرکے بعض نامور غیر مسلم علمی، ادبی اور سیاسی ہستیوں جیسے گاندھی جی وغیرہ کے گورکھپور سے روابط اس داستان کو اور پرکشش بنا سکتے تھے۔ (ک،ص اصلاحی)

مولانا نجم الدین اصلاحی، دلائل السنن والآثار: تخریج و تحقیق: عبد الحنّان عمران اعظمی قاسمی، الجمعیۃ بک ڈپو، گلی قاسم جان، دہلی، ۲۰۲۳ء، صفحات: ۲۵۳، قیمت درج نہیں۔ موبائل:9358144141

مولانا نجم الدین اصلاحیؒ (م: ۱۹۹۴ء) ایک ممتاز عالم دین اور معروف مصنف تھے۔ وہ ثالث ثلاثہ یعنی مولانا فراہی کے تین اہم شاگردوں میں سے ایک تھے۔ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا نجم الدین اصلاحیؒ۔ مولانا فراہیؒ کی مجلس درسِ قرآن میں ان ہی کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ پہلے منتخبہ آیات کی تلاوت کرتے اور اس کے بعد مولانا فراہی ان آیات کا درس دیتے تھے۔ تذکرۂ علماء اعظم گڑھ کے مصنف مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ مولانا نجم الدینؒ جس زمانے میں مدرستہ الاصلاح میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا عبد الغنی پھول پوریؒ کی دعوت پر ملک کے نامور معقولی فاضل و محدث ماجد علی مانوی جون پوریؒ (م: ۱۳۵۳ھ) مدرسہ بیت العلوم میں صحیح بخاری و سنن ترمذی کا خصوصی درس دے رہے تھے۔ مولانا نجم الدین روزانہ مدرستہ الاصلاح سے یہاں آکر درسِ حدیث میں شرکت کیا کرتے تھے۔ اس طرح انہیں بیک وقت اس عہد کے رئیس المفسرین (مولانا فراہیؒ) اور رئیس المحدثین سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ (۱)

مولانا مرحوم نے جو چند کتابیں لکھی ہیں ان میں یاد گار سلف (شیخ محمد امین نصیر آبادیؒ کے حالات زندگی)، مکتوبات شیخ الاسلامؒ (چار جلدیں)، سیرت شیخ الاسلام (دو جلدیں)، التبیان فی آداب حملتہ القرآن، دلائل قرآن (۲) (نامکمل) اور دلائل السلوک قابل ذکر ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب دلائل السنن والآثار، بھی ان کی اہم کتابوں میں شامل ہے۔ اس کتاب پر فن حدیث پر گہری نظر رکھنے والے دو ممتاز علماء مولانا حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے نظر ثانی کی ہے۔ اس کتاب میں حجیتِ حدیث جیسے حساس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، اور منکرین حدیث کے باطل خیالات کی بدلائل تردید کی گئی ہے۔ اس کے چند جلی عناوین مندرجہ ذیل ہیں:

---

(۱) تذکرہ علماء اعظم گڑھ، ص ۵۹۶

(۲) یہ کتاب ابھی غیر مطبوعہ شکل میں ہے۔ مولانا نجم الدین صاحب نے رسالہ "برہان" ۱۹۵۰ء، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۰ء مطابق ۱۳۶۹ھ کے شماروں میں اس کتاب کے مضامین کو شائع کیا تھا۔

سنن و آثار نبوی کی تشریعی حیثیت، قرآن مجید سے حدیثیں کس طرح مستنبط ہیں؟ اس کی دو مثالیں۔ حدیث کے بارے میں صحابہ کا طرز عمل، اشاعت حدیث کے لیے صحابہ و تابعین کا اہتمام۔ صحابہ کرام کی معیاریت پر متاخرین علمائے حق کے فیصلے، دور تدوین، کتابت حدیث، تاریخ وحدیث میں فرق، روایت اور شہادت کا فرق، شرائط رواۃ حدیث و آثار، طبقات المدلسین، دلائل منکرین حدیث، وغیرہ۔

اشاعت حدیث کے لیے صحابہ و تابعین کا اہتمام کے عنوان سے مولانا اصلاحیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر و عمر نے اپنے دور خلافت میں بہت سی احادیث لفظ بلفظ نقل کرا کے اضلاع کے حکام کے پاس بھیجیں۔ یہ احادیث مسائل اور احکام سے متعلق تھیں۔ امیر معاویہ شام سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد تمہیں معلوم ہو تو مجھے لکھ بھیجو۔ امام زہری نے حدیث وروایت کے لیے یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے، جوان، بڈھے، اور مرد اور پردہ نشین خواتین تک سے جا کر آنحضرت ﷺ کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلم بند کرتے (ص ۵۶-۵۷)۔

مولانا مرحوم نے حدیث اور تاریخ میں فرق کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ حدیث کا پلڑا تاریخ پر ہمیشہ بھاری رہے گا۔ روایات سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے، اس کا ثبوت ویسا ہی ظنی ہوتا ہے جیسا کہ تاریخی واقعات کا ثبوت ظنی ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ بھی نہیں ہے جس کی سند اس طرح تسلسل کے عینی شاہدوں تک پہنچی ہو جس طرح حدیث میں پہنچتی ہے (ص ۱۱۴)۔

یہ کتاب پہلی بار سنہ ۱۹۵۶ء میں الجمعیۃ بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اب یہ ایک طویل عرصہ کے بعد دوبارہ منظر عام پر آئی ہے۔ کتاب کی تخریج و تحقیق کرنے والے عبد الحنّان عمران اعظمی قاسمی نے اس اہم کتاب کو عصری تقاضوں کے معیار کے مطابق شائع کیا ہے، لیکن اب بھی کہیں کہیں حاشیہ کی ضرورت باقی ہے۔ (فضل الرحمٰن اصلاحی)

غزل

وارثؔ ریاضی

سکٹا(دیوراج)، پوسٹ بسوریا، وایالوریا، مغربی چمپارن، بہار۔ ۸۴۵۴۵۳

کہاں تک اے غم جاناں کہاں تک ؟
جنوں کی نارسائی ہے وہاں تک
تصور کہکشاں سے بھی ہے آگے
حدیث عشق کب پہنچی زباں تک ؟
وہ کیسا پاسبان لالہ و گل ؟
اجاڑا جس نے میرا آشیاں تک
یہ کیسی آگ سینے میں لگی ہے ؟
نہیں اٹھتا ہے دل سے بھی دھواں تک
کچھ ایسا ہے معما زندگی کا
نہ سمجھا محرم راز نہاں تک
خدا جانے کہ میں کب تک رہوں گا ؟
مگر زندہ ہوں ، دورِ امتحاں تک
زہے قسمت ، دمِ آخر تو آئے
وہ بالینِ مریض نیم جاں تک
مری مدحت سرائی کی رسائی
حضور ہادیؐ کون و مکاں تک
بجز خیرالوریٰؐ کوئی بھی اب تک
نہیں پہنچا فرازِ آسماں تک
اگر دنیا میں وارثؔ ہم نہ ہوں گے
ترس کھائے گا وہ نامہرباں تک

رسید کتب موصولہ

اسماعیل ظفر، **اندھیروں نے مات کھائی ہے (شعری مجموعہ)**: آئی بک ورلڈ، شمس الہدیٰ روڈ، کولکاتا، صفحات: ۲۸۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۱۵۰۴۰۳۱

سید شرافت علی ندوی، **بھوپال علم وادب کے آئینہ میں**: دارالسادات، نزد مسجد حمیدی، خانو گاؤں، بھوپال، صفحات: ۴۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۶۰۹۷۴۰۲

مولانا عبد الستار، **تاریخ مدرسہ عالیہ (۱۷۸۱ تا ۱۹۵۹ء)**: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا، صفحات: ۵۱۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۴۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۰۸۸۵۵۴۴۳۳

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، **تراوشِ قلم**: مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء، بادشاہ باغ، لکھنؤ، صفحات: ۴۶۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۹۵۴۵۵۴۶

سراج الدین ندوی، **جہات تفکر (حصہ اول)**: دارالکتاب، نزد دارالعلوم، دیوبند، ضلع سہارنپور، (یوپی)، صفحات: ۳۵۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۳۳۴۴۱۹

سراج الدین ندوی، **جو اکثر یاد آتے ہیں (حصہ اول)**: ساتھی پبلی کیشنز، سرکڑا، بجنور، (یوپی)، صفحات: ۳۳۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

محمد ناصر سعید اکرمی، **خانوادۂ حسنی کے روشن چراغ**: معہد الامام حسن البنا، بھٹکل، صفحات: ۸۳۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۰۲۱۰۵۳۰۰

ڈاکٹر شاکر فرخ ندوی، **عالم اسلام ایک جائزہ**: صفہ اکیڈمی، مانک مئو، سہارنپور، (یوپی)، صفحات: ۴۰۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۰۱۲۱۵۴۴۶۰

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی، محمّد واضح رشید الحسنی الندوی، حیاتہٗ، افکارہٗ، مآثرہٗ (عربی): دارالرشید، خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج لکھنؤ، صفحات: ۸۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۲۲۹۴۰۹۷

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، **مولانا عبد الماجد دریابادی کا مطالعاتی سفر**: صدق فاؤنڈیشن، خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ، صفحات: ۸۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۳۵۹۲۹۶۷۰

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

FEB 2026 Vol- 213(2) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2026-28

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں و سلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (ڈائرکٹر)